اجتماعی فریضہ بتایا ہے، مصنف نے نصب قاضی کا شرعی حکم، قضا کی حقیقت اور اس کے انعقاد کے شرعی طریقوں پر فقہی تصریحات کی روشنی میں مدلل بحث کی ہے، اور واضح کیا ہے کہ نصب قاضی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، آخر میں ہندوستان میں نظام قضا کا طریقہ کار بتایا گیا ہے، یہ رسالہ فقہی معلومات کے علاوہ اس حیثیت سے بھی مفید اور اہم ہے کہ اس میں وقت کے ایک ضروری مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

رشحات قیصری: مرتبہ جناب مسعود انور علوی کاکوروی صاحب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپیے
پتہ: کتب خانہ انوریہ، تکیہ شریفہ کاظمیہ، کاکوری، ضلع لکھنؤ۔

مولوی محمد عالم صاحب قیصری (متوفی ۱۳۵۰ھ) کاکوری کے علمی و صوفی مشرب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے عمر بھی کم پائی اور بقول مرتب ان کی استعداد بھی اچھی نہ تھی مگر اپنے ماموں کی توجہ اور فیض تربیت سے خوب چمکے، انھوں نے موزوں طبیعت پائی تھی اور اردو و فارسی دونوں میں مشق سخن فرماتے تھے، مگر ابھی تک کلام کی طبع و اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے مسعود انور علوی کاکوروی صاحب نے ان کے اردو کلام کا یہ انتخاب شائع کیا ہے، جو غزلیات پر مشتمل ہے، قیصری صاحب کا رنگ قدیم ہے، مگر کلام عشق کے جوش و مستی اور رنگینی و شوخی سے معمور ہے، مرتب نے مقدمہ میں ان کی شاعرانہ خصوصیات تفصیل سے بیان کی ہیں، اور ان کے حالات بھی عقیدت سے لکھے ہیں۔

نکاح وطلاق: مرتبہ سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶، قیمت دو روپیے، پتہ مکتبہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اردو اور ہندی میں یہ مفید کتابچہ شائع کیا ہے جو نکاح وطلاق سے متعلق بنیادی اور ضروری باتوں پر مشتمل ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۸ء عدد ۵

مضامین

شذرات

افغانستان کے مسئلہ پر چھ برس سے جنیوا میں، جو گفت و شنید وقفہ وقفہ سے ہو رہی تھی اس کے نتیجہ میں افغانستان و پاکستان نے جس معاہدہ پر دستخط کیے ہیں اس پر گواہ اور ضامن کی حیثیت سے امریکہ اور روس کے بھی دستخط ہیں، سمجھوتہ کی رو سے روس اپنی فوجوں کو افغانستان سے واپس بلانے کا کام ۱۵ مئی سے شروع کر دے گا، اور یہ کام ۹ مہینوں میں مکمل ہو جائے گا۔

---

۱۴ اپریل کو ہونے والے جنیوا معاہدہ کا خیر مقدم اکثر ملکوں نے کیا ہے، ہندوستان اور پاکستان کے سربراہوں نے خاص طور سے اس پر مسرت ظاہر کی ہے، جنرل محمد ضیاء الحق نے اسے بیسویں صدی کا معجزہ اور اقوام متحدہ کا ایک کارنامہ بتایا ہے، اور کہا ہے کہ جنیوا معاہدہ سے ہمارے تمام مقاصد حاصل ہو گئے، وزیر اعظم راجیو گاندھی نے سمجھوتہ کے بعد کی صورت حال پر تبادلۂ خیال کے لیے افغانستان کے صدر نجیب اللہ کو نئی دہلی آنے کی دعوت دی ہے، اور وہ ان سطروں کی تحریر کے وقت یہاں آ بھی چکے،

جنیوا معاہدہ کے بارے میں بعض اندیشے بھی ظاہر کیے جا رہے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ اس تعمیر میں کہیں خرابی کی صورت بھی مضمر نہ ہو، افغان مجاہدین کے تمام گروہوں نے اس کو مسترد کر کے تحریک جہاد کو بدستور جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، ان کے نزدیک یہ معاہدہ نہ منصفانہ ہے اور نہ افغان پناہ گزینوں کیلئے قابل عمل کیونکہ انھیں اس کا فریق نہیں بنایا گیا ہے، ان کے لیڈروں نے کہا ہے کہ افغان پناہ گزین اسی وقت وطن واپس جائیں گے جب نجیب اللہ کی حکومت کے بجائے تمام سیاسی پارٹیوں کے نمایندوں پر مشتمل ایک عبوری حکومت قائم ہو جائے، مجاہدین کے اس دو ٹوک اعلان کے بعد بھی صدر نجیب اللہ نے ان کا دل جیتنے کے لیے یہ اپیل کی ہے کہ وہ باغیانہ سرگرمیاں ختم کر کے حکومت سے تعاون کریں، انھوں نے نئی پارلیمنٹ میں انھیں نمایندگی دینے اور اقتدار میں شامل کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی ہے۔

جنیوا معاہدہ کی کامیابی و ناکامی کا ٹھیک اندازہ تو بعد کے واقعات سے ہوگا، لیکن سر دست

یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ جو قوم آزاد رہنے کا عزم مصمم کر لے اس کو نہ جبر و استبداد سے غلام بنایا جا سکتا ہے اور نہ اس پر اس کی مرضی کے خلاف کوئی حکومت مسلط کی جا سکتی ہے، روس کو اس میں جو سخت ناکامی ہوئی اس کی خفت اور شرمندگی مٹانے اور اپنی فوجوں کی باعزت واپسی کے لیے اس نے جنیوا معاہدہ کا سہارا لیا، جس میں امریکہ نے بھی اس کی مدد کی۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے عوام کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر اس کے بحران کا کوئی پائدار اور مستقل حل نہیں نکل سکتا، لیکن اس بنیادی اور حقیقی پہلو کو نظر انداز کر کے بڑی طاقتیں مجاہدین کے مختلف گروہوں کے انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں اور مسئلہ کو مزید الجھانے کے لیے ان کے فقہی و جماعتی اختلافات کو ہوا دے رہی ہیں اور قبائلی عصبیتوں کو بھڑکا رہی ہیں، اب یہ مجاہدین کا کام ہے کہ وہ ہوش و تدبر سے کام لیں اور اسلامی اخوت و اتحاد کا مظاہرہ کر کے اپنے مخالفین کی ریشہ دوانیوں کو ناکام بنا دیں۔

گذشتہ مہینہ تحریک آزادی فلسطین کے فوجی کمانڈر خلیل الوزیر ابو جہاد اور ان کے تین محافظوں کا قتل دنیائے اسلام کا بڑا سنگین حادثہ ہے، تمام امن پسند ملکوں کے سربراہوں نے اس کی سخت مذمت کی ہے ابو جہاد یاسر عرفات کے دست راست اور ان کے بعد پی۔ ایل۔ او کے دوسرے سرکردہ لیڈر سمجھے جاتے تھے، جن کی سرگرمیوں سے اسرائیل سخت پریشان تھا، اس کے خیال میں مقبوضہ عرب علاقوں میں بغاوت تیار کرنے والوں میں ابو جہاد سر فہرست تھے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ اس واقعہ میں اسرائیل پوری طرح ملوث ہے، اس کے وزیر اعظم، وزیر خارجہ اور وزیر دفاع نے قتل کے منصوبہ کی منظوری دی تھی، اور سات قتل کرنے والے جن میں ایک عورت بھی تھی جب اپنا کام مکمل کر کے واپس لگے تو اسرائیلی وزیر اعظم نے وائرلیس کے ذریعہ ان کو مبارکباد کا پیغام بھیجا، یہ بھی خبر ہے کہ اسرائیلی دہشت پسندوں کو امریکہ کی بھی تائید و حمایت حاصل تھی۔

گذشتہ کئی ماہ سے مقبوضہ عرب علاقوں میں فلسطینی نوجوان اسرائیلی تسلط کے خلاف نئے جوش و جذبہ

اور نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کے نتیجہ میں غازہ شہر کے مقامی نہتے افراد اینٹوں اور پتھروں سے جدید ہتھیاروں سے لیس اسرائیلی فوج کا مقابلہ کر رہے ہیں اور بے سروسامانی کے باوجود مزاحمت کی تحریک میں شدت آتی جا رہی ہے، غازہ میں قائم یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی بیداری سے بھی اسرائیل خطرہ محسوس کرنے لگا ہے۔

ابو جہاد کی شہادت اس جہاد کی ایک کڑی ہے جو فلسطینیوں نے اردن کے مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی کو آزاد کرانے کے لیے جاری کر رکھا ہے، یہ واقعہ اسی دن پیش آیا جس دن سلامتی کونسل میں پی۔ ایل۔ او کے نمائندے، عرب، اردن اور غزہ میں اسرائیلی استبداد کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے، جبر و تشدد کے باوجود اسرائیل فلسطینی تحریک کو کچل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے، اسلیے تعجب نہیں ہے کہ اس نے سرکردہ فلسطینی لیڈروں کو قتل کرانے کا منصوبہ بنایا ہو تاکہ فلسطینی عوام کو دہشت زدہ کرکے ان میں مایوسی اور بے یقینی پیدا کر دے۔

لیکن اس طرح کی دہشت پسندانہ کارروائی سے فلسطین کی آزادی کی تحریک ختم نہیں ہو سکتی، یاسر عرفات نے کہا ہے کہ پی۔ ایل۔ او ابو جہاد کے قتل کا بدلہ لے گی، ان کے قتل پر مظاہرے بھی ہوئے اور تین روز کے ماتم کا اعلان بھی کیا گیا۔

فلسطین کے بارہ میں امریکی موقف بھی بدلتا ہوا نظر آ رہا ہے، چنانچہ امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی کے ٹکٹ کے لیے صدارتی امیدوار مائیکل ڈکاکی نے کہا ہے کہ "فلسطین کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا امریکہ کا کام نہیں ہے" ایک اور پرانے صدر مسٹر نکسن نے بھی اسرائیل کو مشورہ دیا ہے کہ "اس سے پہلے کہ عرب لڑنا سیکھ لیں اور اسرائیل کو شکست دیں، اسرائیل عربوں کے ساتھ امن مذاکرات شروع کر دے"، خود واشنگٹن میں بھی غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کے علاقہ میں محدود داخلی خود مختار فلسطینی حکومت کے قیام اور مذاکرات کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی ہے، خیال کیا جا رہا ہے کہ افغانستان کی طرح اسرائیل عرب تنازعہ کے معاملہ میں بھی روس اور امریکہ کے درمیان کوئی مفاہمت ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے، لیکن جس مفاہمت میں فلسطینیوں کے حقوق کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو وہ پائدار نہیں ہو سکتی۔

مقالات

علامہ شبلیؒ کی تنقید نگاری

از

پروفیسر عبد المغنی، پٹنہ،

(۲)

چوتھی جلد میں شاعری کی اصولی بحث سے فارغ ہونے کے بعد علامہ شبلیؒ نے شعر العجم کی پانچویں اور آخری جلد میں "صوفیانہ شاعری"، "اخلاقی شاعری" اور "فلسفیانہ شاعری" کے موضوعات پر جو فکری بحثیں کی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ تنقیدی افکار کے معاملے میں بھی ان کے تصورات مولانا حالی سے زیادہ وسیع ہیں۔ اس وسعت تفکر کا اندازہ مثنوی، قصیدہ اور غزل کی اصناف پر اس تفصیلی تبصرے سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو چوتھی جلد سے پانچویں تک شعر العجم میں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں چوتھی جلد کا باب دوم بھی بہت بصیرت افروز ہے۔ جس کی چند ذیلی سرخیاں ان بلند تصورات کا پتہ دیتی ہیں۔ جو ادب کے متعلق شبلیؒ کے ذہن میں تھے۔ مثلاً

نظام حکومت کا اثر شاعری پر، فوجی زندگی کا اثر۔ اختلاط معاشرت کا اثر شاعری پر، آب و ہوا اور مناظر قدرت کا اثر۔

یہ شاعری کے عمرانی نکات ہیں۔ جب کہ اس سے قبل ہم فنی نکات کی وہ تشریح پیش کر چکے
ہیں۔ جو علامہ شبلیؒ نے کی ہے، ان دونوں نکات کے امتزاج سے ان کے تنقیدی ذہن
میں اخلاقیات و جمالیات کی اس ہم آہنگی کا سراغ ملتا ہے۔ جو انھیں ادب بالخصوص
شاعری میں مطلوب تھی۔ یہ ہم آہنگی ان کی تنقید نگاری میں جامعیت اور توازن کا
سب سے بڑا ثبوت ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر و فن کی دونوں جہتوں پر انکی
دقیقہ رس نگاہ پوری طرح محیط تھی۔

مقالاتِ شبلی (جلد دوم) میں عربی و فارسی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے۔ وہ انکے
تنقیدی تفکر کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں موازنہ کے حسب ذیل بیانات
بہت فکر انگیز ہیں۔

"عرب کا شاعر جو کہتا ہے، اپنی سرگذشت کہتا ہے، اور اس لیے اس کا
جو اثر ہوتا ہے۔ شاہنامہ کا نہیں ہو سکتا۔ عرب میں جو مشہور شاعر گذرے ہیں۔
وہی مشہور بہادر اور جنگ آور تھے۔ مثلاً امرء القیس۔ عمرو بن کلثوم۔ عمرو بن
معدی کرب۔ اس لیے وہ زبان سے وہی کہتے تھے، جو ہاتھ سے کرتے تھے (ص۵۱)

"مناظر قدرت مثلاً پہاڑ، صحرا، جنگل، سبزہ زار، آب رواں، ان چیزوں
کی تصویر بھی جس طرح عرب کا شاعر کھینچ سکتا ہے۔ ایران کے شاعر سے نہیں
کھینچ سکتی۔ اول تو اس قسم کی شاعری ایران میں کم ہے اور ہے تو وہ اصلیت
اور مرقع نگاری نہیں جو عرب کا خاصہ ہے۔ البتہ باغ و بہار کے مضامین نہایت
بہتات کے ساتھ ہیں۔ اور عرب اس باب میں ایران کا مقابلہ نہیں کر سکتا،
اور یہ بھی عرب کی واقعیت پسندی کی دلیل ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے وہی کہتا ہے

اور یہ ظاہر ہے کہ عرب کو باغ و بہار کہاں نصیب تھے۔ یہ ہمارے ہندوستان کا جوہر
ہے کہ نرگس، یاسمین، سنبل، بنفشہ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ لیکن ہمارے قصائد
ایران میں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ یہاں کی کوئی چیز گویا دیکھی ہی نہیں"۔ (ص ۵۳-۵۴)

جذبات انسانی میں سب سے بڑھ کر رنج و غم کا جذبہ ہے، جو مرثیہ کی بنیاد
ہے۔ لیکن ایران کے مرثیے بھی دراصل قصائد ہیں، فرق یہ ہے کہ قصائد میں زندہ
ممدوح کی مدح ہوتی ہے، اور مرثیوں میں مردہ کے اوصاف بیان ہوتے ہیں، بخلاف اسکے
عرب اپنی اولاد، عزیز، دوست، احباب بلکہ اونٹ اور گھوڑے کا مرثیہ لکھتا ہو
اور اس جوش و خروش کے ساتھ لکھتا ہے۔ کہ دل پانی ہو جاتے ہیں"۔ (ص ۵۴)

فارسی شاعری کی ایک بڑی صنف مثنوی ہے جس میں سیکڑوں واقعات
اور ہزاروں خیالات مسلسل بیان کیے جا سکتے ہیں۔ عربی اس سے محروم ہے۔ (ص ۵۵)

عربی شاعری میں فلسفہ بہت کم ہے، بخلاف اس کے فارسی میں ناصر
خسرو، عمر خیام، سحابی نجفی، مولانا روم، عرفی وغیرہ نے ہر قسم کے فلسفہ کے مسائل
اور خیالات ادا کر دیے ہیں۔ (ایضاً)

اخلاقی شاعری عرب میں تھی، لیکن فارسی کی طرح مستقل حیثیت نہیں
رکھتی تھی۔ (ایضاً)

تصوف میں بھی عربی کم مایہ ہے۔ لے دے کر ابن فارض اور محی الدین عربی
کا دیوان ہے، لیکن فارسی نے تصوف کے دریا بہا دیے ہیں۔ (ایضاً)

فارسی شاعری عمر میں عرب کی شاعری سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ
بھی اس کے حدود حکومت بہت وسیع ہیں۔ جس کے مقابلہ میں عرب کی وسعت نقطہ سو

کم ہے۔ اس بنا پر گوناگوں اور رنگ برنگ کے خیالات جو فارسی میں پائے جاتے ہیں،
عرب میں نہیں مل سکتے۔" (ص ۵۵-۵۶)

ایران آب و ہوا اور زمین کی شادابی کی وجہ سے بہشت کا چمن زار ہے اس لیے
ایرانی شاعری کیلئے تشبیہات کا جو سرمایہ ہاتھ آسکتا تھا۔ عرب کو نصیب نہیں ہوسکتا تھا" (ص ۵۹)

ان تقابلی بیانات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ پورے انصاف اور اعتدال کے ساتھ عرب و عجم میں جس کی جو امتیازی خصوصیات اور کمالات ہیں انھیں بلا کم وکاست بیان کر دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ فکر و فن، مواد و ہیئت اور موضوع و اسلوب دونوں پر یکساں نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ شعر العرب نہیں لکھ سکے اور شعر العجم کی تصنیف انھوں نے کردی۔ مگر وہ عربی ادب سے اتنے ہی واقف تھے۔ جتنے فارسی ادب سے۔ دونوں ادبیات کی پوری قدر شناسی بھی وہ بڑے ناقدانہ انداز سے کرتے ہیں۔

مشرقی ادبیات کی کامل آگہی کے سبب ہی علامہ شبلیؒ نے زیر تبصرہ مجموعے کے ایک مقالے "فن بلاغت" میں ارسطو کے حوالے سے مغربی تصور ادب و شعر کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ شاعرانہ بلاغت کا حقیقی مفہوم وہ نہیں ہے، جو اہل مغرب نے دور قدیم کے یونان کی پس ماندہ تہذیب اور اس کے مظاہر فنون سے قائم کر لیا ہے، بلکہ وہ ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں نہایت حکیمانہ تجزیہ سے واضح کر دیا ہے۔ کہ شاعری کی اصلیت و حقیقت کیا ہے۔ جب کہ مغربی افکار نے اس پر دبیز پردے ڈال رکھے ہیں، اس موضوع پر ان کی بحث کا خلاصہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے۔

"اس تمام تقریر سے امور ذیل ثابت ہوئے۔ کلام کی خوبی صرف محاکات کا نام نہیں۔ کلام کی غرض و غایت صرف سامعین کو محظوظ کرنا نہیں بلکہ عقل کی

سفارت اور پیغام بری ہے۔ کلام سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ اس لیے نہیں کہ کلام ایک قسم کی محاکات ہے۔ اور محاکات انسان کی فطرت میں داخل ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ نطق ایک قوت ہے، اور ہر قوت کے استعمال میں انسان کو خواہ مخواہ مزا آتا ہے۔ انسان کا اصلی خاصہ محاکات نہیں۔ بلکہ نطق ہے۔ کلام کی خوبی سچائی پر موقوف ہے (ص ۲۳)

"اہل عرب چونکہ شاعری کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کا نام بھی ایسا رکھا جو خود شعر کی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ شعور احساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخص ہے جسکا احساس قوی ہو..... اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ رنج یا زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ احساس کے وقت اس کی تمام قوتیں جوش میں آجاتی ہیں۔ احساس اس کی قوت متخیلہ کو، نطق کو، آواز کو، لہجہ کو، سب کو ایک بارگی مشتعل کر دیتا ہے۔" (ص ۲۴و۲۵)

اس بنا پر شعر وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن چوں کہ یہ چیزیں جذبات کے کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر شعر میں ان چیزوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ تاہم کوئی شعر نغمہ اور راگ سے بالکل خالی نہیں ہوسکتا۔ خود وزن جو شعر کا ایک ضروری جزو ہے راگ کی ایک قسم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ شعر کو گا کر پڑھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شعر پڑھنے کو اہل عرب انشاد کہتے ہیں۔ جس کے معنی گانے کے ہیں۔ (ص ۲۸)

ایک اور عام غلطی کا رفع کر دینا ضروری ہے۔ اکثر لوگ شعر اور نثر بلیغ کو ایک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قدما میں ارسطو اور متاخرین میں جان کل کا یہی مذہب ہے

.....ارسطو کا خیال اس حد تک صحیح ہے کہ وزن پر شعر کا مدار نہیں، لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ وزن شعر کے اجزا میں داخل نہیں، وزن شعر کا جز ہے۔" (ص ۲۷)

بلاغت اور شاعری کی یہ تشریحات علامہ شبلیؒ کی وسعت نظر اور دقت نظر دونوں کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ انھوں نے ادب کے حقایق کی توضیح عمرانی، نفسیاتی اور جمالیاتی طریقوں سے کرنے کے ساتھ ساتھ معنی و اخلاق کی اولین اہمیت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ یہ تصور تنقید ایک ایسے صاحب ذوق اور ادا شناس فن کا ہے جو ایک عظیم عالم اور معلم اخلاق بھی ہے۔ علامہ شبلی کے ذہن کی یہ جامعیت انھیں ادبی مطالعات میں ارسطو اور مل جیسے مفکرین پر فوقیت دیتی ہے۔ ان کی نگاہ مغرب کے قدیم و جدید ناقدین ادب سے زیادہ تیز اور بصیرت زیادہ گہری ہے۔ اس معاملہ میں ان کی دوربینی کا عالم یہ ہے کہ نام نہاد نثری نظم کے نفی شاعری ہونے کی صراحت انھوں نے ہمارے ادب میں اس کا غلغلہ بلند ہونے سے سالہا سال قبل ہی کر دی۔ ان کا یہ قول "شعر وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے۔ شاعری کی تعریف میں نہ صرف قول فیصل بلکہ حرف آخر ہے۔ دنیا کی کسی زبان اور اس کے کسی دور کی تنقید اس تعریف پر کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔ فن شعر کی ایسی جامع، واضح اور موثر تشریح عالمی سطح پر علامہ شبلیؒ کے کسی پیش رو کے یہاں شاید ہی پائی جائے۔ اس سلسلے میں ان کے خیال کی تازگی آج تک قائم ہے۔ اور آیندہ بھی رہے گی۔ اس خیال کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ شعر کے فنی عناصر تین ہیں؛ اول اس کا موزوں و مقفی ہونا ہے۔ اس لیے کہ ان کی تصریح کے مطابق قافیے کے بغیر وزن کا کوئی مطلب و معیار نہیں ہوتا۔ دوم اسکے آہنگ میں نغمگی کا وجود ہے۔ اس لیے کہ شعر کا وزن اصلاً غنائیت سے قائم ہوا ہے، اور موسیقی پر مبنی ہے۔ سوم وزن و نغمہ کے ساتھ حرکیت اور روانی بھی ہونی چاہیئے۔ تاکہ نغمہ مست رگ اور

خواب آور نہ ہو، اس کے اندر ایک چستی ہو جو حواس کو بیدار کرنے والی ہو، اس کے علاوہ شعر کے لیے جس جذبہ و جوش کی ضرورت ہے۔ اس کے اظہار کی ایک علامتی شکل رقص ہے۔ ان تینوں عناصر کی یک جائی ایک معیاری شعر کو وجود بخشتی ہے جب کہ نغمہ و رقص کی کی کیفیات کے بغیر صرف وزن محض ایک نظم پیدا کر سکتا ہے اقبال کا مشہور مصرع۔

ع شعر گویا روح موسیقی ہے۔۔۔ رقص اس کا بدن

اس معیاری شعریت کی طرف اشارہ کرتا ہے

کلیم الدین احمد کے بعض اعتراضات

کلیم الدین احمد نے "اردو تنقید پر ایک نظر" میں علامہ شبلی کی تنقید نگاری کے متعلق مندرجہ ذیل فیصلہ کیا ہے۔

"حالی نے اردو میں نئی تنقید کی ابتدا کی تھی اور قدیم تنقید سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں۔" (ص ۱۰۹)

اس تبصرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علامہ شبلیؒ کی تنقید نگاری میں توسط اور اعتدال ہے۔ وہ قدیم و جدید دونوں سے مرکب اور ان کی جامع ہے۔ لیکن تبصرہ نگار کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ وہ ان کی تنقید میں تذبذب کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ اس نے اپنے تبصرے کا آغاز اس طرح کیا تھا:

"حالی کے بعد شبلی کا نام آتا ہے۔ شبلی نے بھی بعض بنیادی امور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی اور حالی کی طرح مشرقی و مغربی نقادوں سے استفادہ کیا۔" (ص ۱۰۰)

یہ ایک امید افزا آغاز تھا مگر اس کا انجام اقتباس میں جس خیال پر ہوا ہے وہ مایوس کن ہے۔ اس فرق کی وجہ کلیم الدین احمد کے مطالعہ کی خامی اور تنگ نظری ہے وہ علامہ شبلیؒ

اور مولانا حالی کو ایک ہی پیمانے پر رکھ کر دونوں کے متعلق ایک ہی جیسا حکم لگا دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر قوت تمیز کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ شبلی کی تنقید کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش بھی انھوں نے نہیں کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے تمام تنقیدی مباحث ان کے سامنے نہیں ہیں، یا وہ ان سے صحیح نتیجہ نکالنے کے لیے آمادہ نہیں اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کے مغالطے کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ وہ الفاظ کی اہمیت کے متعلق علامہ شبلی کے ایک بیان کا حوالہ دے کر کہتے ہیں۔

"اس جملہ سے خیالات و جذبات اور الفاظ میں جو ناگزیر تعلق ہے۔ اس سے بے خبری ظاہر ہوتی ہے۔" (ص ۱۰۵)

یہ بات صحیح نہیں، راقم السطور اس موضوع پر ان کے ان بیانات کا حوالہ دے چکا ہے۔ جن سے عیاں ہے کہ ان کے نزدیک بنیادی اہمیت معانی کی ہے اور وہ الفاظ پر زور صرف ان کے ذریعہ اظہار ہونے کے سبب دیتے ہیں۔ مواد شاعری کے متعلق ادراک و احساس کی بحث (ص ۱۰۱) میں بھی کلیم الدین احمد نے علامہ شبلی کے جس مغالطے کا ذکر کیا ہے وہ درحقیقت خود انھیں ہوا ہے۔ اس لیے کہ احساس کے مواد شاعری ہونے کا مطلب علامہ شبلی کے نزدیک ہرگز یہ نہیں ہے۔ کہ وہ ادراک سے خالی ہو۔ اس موضوع پر اپنے بیانات میں وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صریحاً یہ ہے کہ ہر قسم کے افکار و خیالات یا واقعات و حادثات جب شاعر کے تخیل میں آتے ہیں تو احساس بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادراک بھی احساس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے وہ اصل عربی مفہوم کے حوالے سے شاعر کا مطلب صاحب شعور بتاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کے کچھ ذہنی تحفظات یا تعصبات بھی انھیں دھوکا دیتے ہیں اور

ڈبے جا اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ مرثیے کی بحث میں کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ چونکہ مراثی "مقتضائے حال کے موافق" (ص ۱۰۸) نہیں ہیں اور ان میں کربلا کے خطے کے بجائے لکھنؤ کی معاشرت کا نقشہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا علامہ شبلی کا انھیں فصیح و بلیغ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ایک زبردست لغزش ہے، اس سلسلے میں وہ بھول جاتے ہیں کہ علامہ شبلی نے "موازنۂ انیس و دبیر" کربلا کے واقعات کی علمی تاریخی تحقیق کے لیے نہیں لکھا تھا۔ جس کے وہ اپنے دور میں سب سے زیادہ اہل تھے، بلکہ ان مراثی کی شاعرانہ اہمیت واضح کرنے کے لیے جو انیس نے نہایت فن کارانہ طور پر پیش کیے تھے۔ لہٰذا مراثی کی تنقید میں سارا معاملہ ادبی فصاحت و بلاغت کا تھا، نہ کہ تاریخی حقیقت و صداقت کا۔ اس صورت حال سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ کے سامنے کلیم الدین احمد سے بہتر معیار تنقید تھا۔ اور ان کے ادبی تصورات زیادہ بالیدہ تھے۔

علامہ شبلی اور عبادت بریلوی

عبادت بریلوی نے اپنی کتاب "اردو تنقید کا ارتقا" میں علامہ شبلی کے متعلق جن خیالات پر اپنے مطالعے کا اختتام کیا ہے وہ بالعموم صحیح ہیں۔

"شبلیؒ نے عوام کے اندر شعر کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں بہت مدد کی اور شعر کہنے والوں میں شعر کا صحیح شعور پیدا کیا۔ جس سے اردو تنقید بھی مالا مال ہوئی۔ انھوں نے عملی تنقید کا بھی اچھا خاصا سرمایہ چھوڑا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی عملی تنقید میں وہ نقاد سے زیادہ شارح نظر آتے ہیں۔ انھوں نے معانی و بیان کی اصطلاحات سے بھی اچھا خاصا کام لیا ہے۔ لیکن بہر حال ان کی تنقید سے ان شعرا کے کلام کو سمجھنے میں اچھی خاصی مدد ملتی ہے۔ جن پر وہ تنقیدی نظر ڈالتے ہیں،

اور پھر عموماً ان کی یہ تنقید اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ہوتی ہے۔

بہر حال شبلی کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے مسلم ہے۔ ان کی نظر میں دقت اور گہرائی ہے۔ جدت اور اپج ہے، اور ان کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں۔ تنقید اور ادبی تجزیے کے میدان میں وہ کسی سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے جمالیاتی ذوق کی بلندی۔ ہر شکل میں حسن کے احساس کی صلاحیت اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعے نے ان کو اس مرتبے پر پہنچا دیا۔ ہے جس پر ان کے زمانے میں کوئی نہیں پہنچ سکا۔" (ص ۱۹۰)

اس تحسین کے باوجود، جس میں کچھ نقص بھی ہے، عبادت بریلوی شکایت کرتے ہیں۔ کہ "اپنے تنقیدی نظریات پیش کرتے ہوئے۔ علامہ شبلیؒ نے فلسفیانہ بحثیں کی ہیں لیکن ان مباحث میں سماجی پہلوؤں پر کم زور دیا ہے۔ حالانکہ انھیں اس کا احساس ضرور ہے کہ ادب و شعر سماجی اہمیت کے مالک ہوتے ہیں۔" (ص ۱۹۶) اس تبصرے میں جو تذبذب و تخالف ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے سماجی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس انداز سے فلسفیانہ بحثیں کرتے ہیں۔ ان سے کسی کو اتفاق نہ ہو۔ اسی طرح عبادت بریلوی کا یہ جملہ بھی محل نظر ہے کہ وہ "شعر کی ظاہری خوبیوں کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ (ص ۱۹۶) سمجھنے کی بات یہ ہے کہ علامہ شبلی ظاہری خوبیوں کو جو کچھ اہمیت دیتے ہیں وہ باطنی خوبیوں کے ساتھ ہے، ان کے نزدیک نہیں انھوں نے قومی جذبے کے اظہار کو جو شعر کہا ہے، اس پر عبادت بریلوی کا اعتراض اصل بحث کے سیاق و سباق سے الگ ہے۔ اسکے علاوہ اس میں علامہ شبلی کے تمام مباحث کو مد نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ فی الواقع قومی جذبے کو تفکر سے خالی نہیں تصور کرتے بلکہ اس کا ترفع سمجھتے ہیں۔ ان کے اس خیال کو بھی سمجھنے کی کوشش عبادت بریلوی نے

نہیں کی کہ "اصلی شاعری وہ ہے۔ جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔ درحقیقت اس بیان میں علامہ شبلیؒ شاعری اور خطابت کا فرق واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ خطابت میں سامعین موجود ہوتے ہیں۔ اور شاعری بالعموم تنہائی میں کی جاتی ہے۔ ورنہ شاعری کی سماجی اہمیت کا ذکر تو۔ خاص کر شعر العرب پر لکھتے ہوئے علامہ شبلیؒ نے بہت زور و شور کے ساتھ کیا ہے۔ بریلوی کا یہ تبصرہ تو بالکل مہمل ہے۔ کہ علامہ شبلیؒ نقاد سے زیادہ معانی و بیان کے عالم نظر آتے ہیں۔" (ص ۱۹۵) معانی و بیان کے عظیم ترین عالم وہ یقیناً تھے۔ اردو ادب نے ان سے بڑا عالم پیدا نہیں کیا ہے۔ مگر وہ نقاد بھی اس درجے کے تھے، جس درجے کے عالم تھے۔ بلکہ دراصل یہ ان کی علمیت ہی ہے۔ جو انھیں اپنے وقت کا سب سے بڑا نقاد ادب بنانے کا باعث ہوئی۔

علامہ شبلیؒ کا اسلوب بیان

علامہ شبلیؒ کا اسلوب بیان ان کے انداز تنقید کا بہترین اشارہ ہے۔ یہ بیک وقت نہایت ادبی اور عالمانہ و حکیمانہ اسلوب ہے۔ جو انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ اور آیندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بنا دیتا ہے۔ یہ حقیقت ایک تقابلی مطالعے سے بہ خوبی واضح ہو جائے گی۔ علامہ شبلیؒ۔ مولانا حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کے طرز تحریر کے اقتباسات اس مقالے میں دیے جا چکے ہیں۔ ان کا موازنہ کرنے سے جو نکات دریافت ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ گرچہ یہ صرف دیے ہوئے اقتباسات پر نہیں۔ تینوں مصنفین کی تمام تحریروں پر مبنی ہیں۔

۱۔ علامہ شبلیؒ و مولانا حالی دونوں کی نثر علمی نثر ہے۔ اور اس میں وہ وضاحت و قطعیت ہے۔ جو ایک حکیمانہ اسلوب کے لیے درکار ہے۔ جب کہ آزاد کا انداز تخیلی انشا پردازی کا ہے۔ جس میں شعریت اور افسانویت زیادہ ہے، علم و حکمت کم۔

۲۔ اس لحاظ سے تنقید کی موثر زبان دی ہے۔ جو علامہ شبلیؔ و مولانا حالی نے اختیار کی ہے جب کہ آزاد کی زبان غیر تنقیدی ہے۔ خواہ اس میں دلچسپی اچھی خاصی ہو۔

۳۔ لیکن علامہ شبلیؔ و مولانا حالی کے درمیان فرق یہ ہے کہ مولانا حالی کے بیان میں زور اور شگفتگی کی کمی ہے۔ جب کہ علامہ شبلیؔ کے اسلوب میں طاقت و انبساط کی فراوانی ہے۔

۴۔ تجزیاتی انداز دونوں کی تحریروں میں ہے۔ مگر شرح و بسط علامہ شبلی کے یہاں مولانا حالی سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے نکات کی جتنی مکمل تشریح علامہ شبلی کرتے ہیں۔ مولانا حالی نہیں کر پاتے۔

۵۔ علامہ شبلیؔ اپنے بیان کو کثیر مثالوں سے محکم کرتے ہیں۔ جب کہ مولانا حالی کچھ سرسری حوالے دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس لیے جو وضاحت و صراحت علامہ شبلیؔ کی تحریر میں عیاں ہے، وہ مولانا حالی کی تحریر میں نمایاں نہیں۔

۶۔ علامہ شبلیؔ کی زبان میں زیادہ ثروت ہے۔ جو اسلوب بیان میں بے پناہ بلاغت کا باعث ہے۔ جب کہ مولانا حالی کے طرز نگارش میں صرف فصاحت ہے

۷۔ سلاست دونوں کی تحریروں میں ہے۔ مگر برجستگی اور روانی علامہ شبلیؔ کی نثر میں لازماً پائی جاتی ہے۔ وہ بعض اوقات مولانا حالی کی نثر میں نہیں ملتی۔ خواہ وہ بہ کثرت اور بلا ضرورت انگریزی الفاظ کے استعمال کے سبب ہو یا دقیق عربی الفاظ کے باعث۔

۸۔ علامہ شبلیؔ کی نثر میں مترادفات کا استعمال بھی ان کے اسلوب کی محکمی کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس سے بیان میں چستی آتی ہے۔ جب کہ حشو و زوائد کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔

بلکہ معانی و مضمرات کی تہوں اور مفاہیم کی باریکیوں کا سراغ ملتا ہے۔

۹۔ علامہ شبلیؔ کی نثر میں جو خوش سلیقگی، عمدگی، ندرت، تازگی اور نظم و ضبط ہے۔ وہ مجموعی و عمومی طور پر مولانا آزاد اور مولانا حالی کی نثر میں نہیں ہے۔ عربی و فارسی کے زیادہ بڑے عالم ہونے کے باوجود علامہ شبلیؔ نے اردو زبان پر ثقیل الفاظ و تراکیب کا بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ اور بھاشا کے بھی رکیک الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ خیالات کی طرح علامہ شبلی کے طرز بیان میں بھی توازن ہے۔

علامہ شبلی کے تنقیدی اثرات مابعد کی اردو تنقید پر علامہ شبلیؔ کا اثر بہت گہرا اور وسیع ہے۔ اگرچہ جدید ناقدوں کا ایک بڑا طبقہ فکری لحاظ سے بالکل مختلف راستے پر چل نکلا خاص کر جو معاصرین ادب مغربی تصورات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ ذہنی طور پر ان سے الگ راہ پر گام زن ہوئے، حالانکہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو فن کی اہمیت پر زور دینے کے سبب ان کے حلقۂ فکر سے اگر وابستہ نہیں تو بہت قریب ہو سکتے تھے۔ مگر ان کی انگریزی تعلیم و تربیت اپنا حقیقی ورثہ پہچاننے میں ان کے مانع آئی، فی الواقع بعد کی تنقید مشرق و مغرب کی تفریق پر زور دینے لگی اور اس کے نتیجے میں اس کا بڑا حصہ نہایت مصنوعی طور پر اپنی روایت سے کٹ گیا یا منحرف ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم تذکروں کی ادبی تنقیدوں کو تنقید تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا گیا، بہرحال علامہ شبلیؔ کی بنائی تنقیدی روش پر ایک پورا دارالمصنفین قایم ہوگیا۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کی روایات کو بہت ہی وقیع مقالات و کتب تصنیف کر کے باقی رکھا۔ ان کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی نے ادبی تنقید کا وافر سرمایہ فراہم کیا۔ ان دونوں کے بعد بھی ریاست علی ندوی نے، شاہ معین الدین ندوی، ابوالحسن علی ندوی، اور سید صباح الدین عبدالرحمن

ادبی معارف کی شمع فروزاں رکھی۔ اس سلسلے میں دیگر جن چند ناقدین کے نام لیے جاسکتے ہیں، ان میں سب سے نمایاں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر سید عبداللہ ہیں۔ علی گڑھ کے رشید احمد صدیقی کا انداز تنقید بھی کم از کم اپنے اسلوب بیان میں علامہ شبلیؒ ہی کی یاد دلاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے شغل تحقیق اور طرز بیان پر بھی علامہ شبلیؒ کا پرتو پڑا ہے۔ آل احمد سرور کی شگفتہ نثر نمایاں طور پر باغ شبلی کا ایک غنچہ بلکہ گل نودمیدہ ہے۔ اختر اورینوی کی شوکت بیان پر علامہ شبلی کے اسلوب کا عکس واضح ہے۔ نیاز فتح پوری اگر ادب کے ساتھ ساتھ علم سے بہرہ ور ہوتے تو انھیں علامہ شبلیؒ کے دبستان تنقید کا ایک رکن تصور کیا جاتا۔

کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کا معاملہ یہ ہے کہ اول الذکر ادب میں فن کی اہمیت کے علم بردار ہونے کے سبب ایک جہت سے علامہ شبلی کے ساتھ وابستہ ہو سکتے تھے۔ مگر فن کے متعلق ان کا انتہا پسندانہ مغربی نقطۂ نظر ان کو علامہ شبلی کے جادۂ اعتدال سے بہت دور لے گیا۔ جب کہ ان کے طرز بیان پر مولانا حالی کا اثر زیادہ پڑا۔ اس کے برخلاف احتشام حسین کا اسلوب تحریر بداہۃً علامہ شبلی سے متاثر ہے۔ اور اس لیے بہت محکم اور باوقار ہے۔ گرچہ اس شگفتگی سے خالی ہے جو علامہ شبلی کی زبان کا طرۂ امتیاز ہے علاوہ ازیں اشتراکی تفکر احتشام حسین کو علامہ شبلیؒ کی اخلاقیات سے جدا کر دیتا ہے۔ وقار عظیم کی اعتدال پسندی میں علامہ شبلی کے توازن کا ایک رنگ ہے۔ لیکن وقار عظیم کی نثر مولانا حالی سے زیادہ قریب ہے۔

عصر حاضر کے تنقید نگاروں میں اسلوبیات کے علم بردار علامہ شبلی سے اپنا رشتہ کسی حد تک جوڑ سکتے تھے۔ لیکن اول تو اسلوبیات میں غلو انھیں علامہ شبلی کے راستے سے

ہٹا دیتا ہے، دوسرے انھیں ان مشرقی اسلوبیات کی بہت کم واقفیت ہے، جن سے علامہ شبلی کی تنقید فن کا ساز و برگ مہیا ہوا ہے۔ جدید ترین ناقدوں سے قبل ڈاکٹر خورشید الاسلام نے رشید احمد صدیقی کے اس طرز بیان کو کچھ ترقی دی۔ جس پر علامہ شبلی کے اسلوب کی چھاپ تھی۔ خلیل الرحمان اعظمی کی مشرقی حسیات علامہ شبلیؒ سے قدرے مستفید ہونے کے باوجود بالعموم مولانا حالی کے طرز نگارش میں بروئے اظہار آئیں۔ حسن عسکری کی مشرقیت پر علامہ شبلی کی علمیت سایہ فگن نہیں، مستشرقین کی ناواقفیت حاوی ہے، جب کہ عسکری کی جملہ بازی زیادہ سے زیادہ علامہ شبلی کی شگفتگی کی ایک خام نقالی کہی جاسکتی ہے۔

علامہ شبلی کی تنقید نگاری کی جامعیت و خصوصیت

ایک کامل نقاد کی تمام خصوصیات علامہ شبلیؒ کی ادبی شخصیت میں موجود ہیں۔ اول تو وہ ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب و شاعر بھی ہیں۔ گرچہ ناقد کے لیے شاعر ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن بہرحال یہ ایک اضافی صفت ہے۔ اور اردو سے زیادہ ان کی فارسی شاعری اس کی آئینہ دار ہے۔ جو غالب کی فارسی شاعری سے کسی طرح کم نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں اور اردو کا کوئی نیا یا پرانا نقاد علمیت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً تاریخ انسانی کے عظیم ترین علما میں ایک تھے، اور انھوں نے جو زبردست علمی کارنامے انجام دیے انکے اثرات اتنے وسیع اور دوررس ہوئے کہ بعد کے اکثر بہترین علما ان سے کسی نہ کسی طور وابستہ کہے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہہ علامہ شبلی مشرقی علوم کے ماہر تھے۔ اور مغربی علوم سے ان کی جو کچھ واقفیت تھی۔ گرچہ وہ اچھی خاصی تھی۔ بیشتر بالواسطہ اور تراجم کے ذریعہ تھی، لیکن مشرقی ادبیات کے ایک ناقد کے لیے مشرقی علوم وفنون پر قدرت کافی ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی و مغربی علوم کی تفریق مصنوعی ہے۔ اور اہل مغرب کے دور اقتدار میں

اہل مشرق کی ان سے مرعوبیت اور خود مغربی علما کے بے جا غرور و تکبر کی بنا پر کی گئی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اہل مغرب نے سارے جدید علوم و فنون اصلاً و ابتداءً اہل مشرق ہی سے سیکھے اور یونانی و رومی ادبیات کی معلومات انھیں عربوں سے حاصل ہوئیں، لہٰذا علوم و فنون کو مغربی و مشرقی کے خانوں میں تقسیم کرنا ایک سراسر غیر علمی حرکت ہے اور یہ محض تاریخ کا ایک قدرتی عمل ہے، کہ بعض وقت علم و حکمت کی زیادہ ترقی مشرق میں ہوئی اور بعض وقت مغرب میں۔ رہی بات قدیم و جدید کے فرق کی تو یقیناً علامہ شبلیؒ کی تعلیم و تربیت قدیم علوم کے گہوارے میں ہوئی۔ مگر وہ جدید علوم سے بے بہرہ نہیں تھے، خاص کر تاریخ و سیرت کے معاملے میں وہ اپنے عہد کے مغربی مؤرخوں سے ہرگز کم تر نہ تھے بلکہ متعدد امور میں بہتر تھے۔ اس کے علاوہ قدیم و جدید کی تفریق بھی اسی طرح مصنوعی ہے۔ جس طرح مشرقی و مغربی کی، اس لیے کہ ہر جدید بالآخر قدیم ہو جاتا ہے۔ اور ہر قدیم اپنے وقت میں جدید ہوتا ہے۔

لہٰذا جس نکتے پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اردو تنقید کی روایت میں علامہ شبلی کی انفرادیت کیا ہے؟ یہ تو مسلم ہے کہ علامہ شبلی و مولانا حالی نے تذکروں کی تنقید نگاری کو وسعت و ترقی دے کر ادبی تنقید کا وہ اسلوب پیدا کیا جو رائج الوقت ہے اور کچھ ناقدین سمجھتے ہیں کہ بعد کی اردو تنقید نے اپنے اولین معماروں کے کارنامے پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا ہے، لیکن اضافے کی بحث سے قطع نظر اصل اہمیت اس سوال کی ہے کہ دونوں نے تنقید کی جو راہیں نکالیں ان میں کون زیادہ روشن، زیادہ محکم اور منزل مقصود کی جانب لے جانے والی ہے؟ جواب کا تجسس کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تذکروں کے دور سے نکل کر آگے بڑھنے والی سیدھی راہ وہ ہے جس پر علامہ شبلی گامزن تھے۔ اور جسے مزید ہموار اور استوار کر کے انھوں نے اپنے بعد آنے والے قافلوں کے لیے بڑی سہولتیں پیدا کر دیں۔ رہنما نشانات نصب کر دیے اور

منزل کی جہت بالکل نمایاں کر دی، اگر تنقید کا کام فن کے لیے فضا کی سازگاری بھی ہے، تو وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی عظیم ترین شاعری اس ماحول میں نمودار ہوئی، جس کو سب سے زیادہ علامہ شبلی کی تحریروں نے تیار کیا۔ مولانا حالی نے پیروی مغرب کا مشورہ دیا تھا۔ جب کہ علامہ شبلی احیائے مشرق میں منہمک تھے، مولانا حالی نئی نسلوں کو جو اکے رخ پر لے جانا چاہتے تھے، لیکن علامہ شبلی کا پیغام وہ تھا۔ جو اقبال کی زبان سے ان لفظوں میں نشر ہوا۔

اگر زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز

اب خواہ سیاست میں تحریک آزادی ہو یا مذہب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا ادب میں مشرقی اقدار کا فروغ، سب کے علم بردار مولانا حالی سے بہت زیادہ علامہ شبلی تھے، ان کے بعد ملک آزاد بھی ہوا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے جلوے بھی نظر آئے۔ اور مغربی اقدار کے مقابلے میں مشرقی اقدار کی برتری بھی عیاں ہونے لگی ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ علامہ شبلی کی تنقید نگاری ادب کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔ یا ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ چند سال پیشتر مغربی افکار کا جو جو طلسم ہمارے معاشرے پر طاری تھا۔ وہ ٹوٹتا نظر آ رہا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے۔ کہ علامہ شبلی کی تنقید اور اقبال کی شاعری نے مل کر زندگی اور تہذیب کی جن صداقتوں کو آشکار کیا تھا۔ ان کا ادراک آہستہ آہستہ عام ہونے لگا ہے۔ اور زمانے کا رجحان ان آفاقی تصورات کی جانب ہو رہا ہے۔ جو کائنات میں انسان کے مقدر کی تعمیر کر سکتے۔ اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب

از

حافظ سید ولی حسین جعفری، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تغلق آباد، نئی دہلی

اس مضمون میں ہم دنیا کے تین (۳) اہم اور بڑے مذاہب پر ایک اجمالی نگاہ ڈال کر یہ واضح کریں گے کہ انھوں نے نئے دور کے رجحانات کو اپنے اندر کس حد تک سمویا اور ان سے کس حد تک متاثر ہوئے، یا ان میں کس نے اپنے عقیدہ و مذہب کے دائرہ میں رہ کر ان کا مقابلہ کیا، اور ان کو ناقابل قبول بتایا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان مذاہب میں جدید نظریات کا مقابلہ کرنے کی کس حد تک صلاحیت ہے، یہ مذاہب ہیں ہندو ازم، مسیحیت اور اسلام، اور جو نظریات زیر بحث آئیں گے وہ یہ ہیں: کمیونزم، سیکولرزم، رشنلزم یا عقلیت اور تصوف۔

مسیحیت | یہ تینوں نظریات اپنے مخصوص دور کی پیداوار ہیں، پروفیسر مجیب مرحوم کے اس جملہ سے ہم کو صورت حال تک پہونچنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ "فرانسیسی انقلاب اس ذہنی تغیر کی علامت ہے، جس نے مذہب، سیاست اور معاشیات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا"[1] یعنی ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ یہ تینوں اہم اجزاء جو کہ فرد کے لیے ضروری اور سماج کیلئے بھی نہایت اہم ہیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو گئے، اور اس دور کے مفکروں اور

---

[1] تاریخ فلسفۂ سیاست۔ محمد مجیب، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ص ۳۹۱۔

فلسفیوں نے بھی ان تینوں کو الگ الگ رکھنے میں نمایاں حصہ لیا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ان حضرات نے مذہب ہی کو تمام کمزوریوں اور خرابیوں کا سبب سمجھا، اور ہر وہ نظریہ پیش کیا جو مذہب کے برعکس تھا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا زمانہ مذہب والوں کے لیے شکست کی علامت ہے، کیونکہ سائنس کو فروغ اسی زمانہ میں ہوا، اور اصل اقتدار کا مرکز کلیسا کے ہاتھ سے نکل کر مادیت کے علمبرداروں کے ہاتھ میں چلا گیا[1]

آخر اہل مذاہب کو سلطنت و اقتدار کے آگے جھکنا کیوں پڑا، جب کہ اس سے پہلے ان ہی کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ ڈور تھی، یہی نہیں بلکہ ردعمل کے طور پر ہر نظریہ مذہب سے الگ یہاں تک کہ اخلاقیات کو بھی نظرانداز کر دیا گیا، یہاں پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کی ہی تعبیر و تشریح غلط انداز پر کی جا رہی تھی اور اہل مذہب اس کو اپنی ہوا و ہوس کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے، یا اوہام و خرافات کو مذہب کا نام دے دیا گیا تھا، چنانچہ وہ سائنس کے آگے بے بنیاد اور کھوکھلا ثابت ہوا، جس کے نتیجہ میں سماج کے اوپر سے مذہب کی بالادستی ختم ہوئی،

یہاں یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ قرون اولیٰ میں عیسائی مذہب کی تبلیغ اس کے پرجوش مبلغوں پطرس، اسٹیفن اور سینٹ پال وغیرہ کی کوششوں سے ہوئی، اسی دور میں جہاں ان حضرات کی وجہ سے عیسائیت نے یہودیت سے الگ اپنی جداگانہ مذہبی حیثیت اختیار کر لی تھی وہاں مختلف عقائد نے بھی جنم لیا، جس کے نتیجہ میں تثلیث، مادر خداوند، آسمانی بادشاہت، اور الوہیت مسیح جیسے عقائد اس مذہب کی بنیاد بن گئے۔

سترہویں صدی عیسوی تک یورپ کی عملی بادشاہت پوپ کے ہاتھوں میں تھی، پوپ

---

[1] سوشلزم - ایک غیر اسلامی نظریہ از وحید الدین خان ص ۳۶، تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی۔

کی حیثیت خدا کے نائب کی تھی، اور اس وجہ سے وہ کسی بھی آدمی کا ہر قسم کا گناہ معاف کر سکتا تھا، یوحنا نے اپنی انجیل میں اس کا ذکر کیا ہے، دیکھیے صفحات ۲۰-۲۱-۲۳، اسی نظریے نے آگے چل کر مذہبی رہنماؤں کو تقویت دی اور اس کا استحصال بھی خوب ہوا، آج یورپ میں مذہب سے جو بیزاری کی لہر آئی ہوئی ہے وہ اسی کا ردعمل ہے جو نسلاً بعد نسل اب تک چلی آرہی ہے اور یہ وبا، یورپ کے اثر سے تقریباً ہر خطہ میں پروان چڑھ رہی ہے۔

عیسائی مذہبی ادب آج جو کچھ دستیاب ہے، نہ تو اللہ کا کلام ہے، نہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں ہی کا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حواریوں کے تلامذہ کا تحریر کردہ ہے، جس میں ان لوگوں نے اپنے علم و فہم کی بنیاد پر حضرت عیسیٰؑ کے حالات اور ان کی تعلیمات کو اکٹھا کیا ہے، مسیحی تعلیم کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تمام اناجیل یونانی زبان میں تحریر کی گئی ہیں، جب کہ حضرت عیسیٰؑ کے تمام حواریوں کی زبان سریانی تھی، ویسے ان میں حذف و اضافہ کا سلسلہ آج تک جاری ہے[۱]، اس لیے یہ گمان یقین میں بدل جاتا ہے کہ مسیحی تعلیمات کا دارومدار نہ اللہ کے کلام پر ہے اور نہ حضرت عیسیٰؑ کے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ حضرت مسیحؑ کی جانب جو تعلیمات منسوب ہیں وہ دراصل وہی ہیں جو آج مسیحی دنیا کا عقیدہ ہے[۲]۔

عیسائیت کے اس اجمالی تعارف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کو جب مذہب کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی تو اس نے ان نظریات کو جو وہاں مقبول ہو رہے تھے، مذہب سے مطابقت دینا شروع کر دیا، گویا اس طبقہ کو جس عافیت کے لیے مذہب سے بالکل کنارہ کش ہوجانا ناممکن تھا، اپنی فلاح و عافیت اسی میں نظر آئی یہ طبقہ سائنس کی کامیابی سے بہت متاثر تھا،

[۱] ڈاکٹر عبدالرشید: ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ ص ۳۱۹ [۲] ایضاً۔

مگر مذہب کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا، اس بنا پر اس نے مذہب میں لچک پیدا کر کے اور جدید نظریات کو مذہب کے اندر داخل کرنے کو ہی اس کی خدمت جانا، اس دور کے مشہور پادریوں نے عیسائی اشتراکیت کی ایک مخصوص اصطلاح وضع کی تھی، جس کا مطلب ہے سوشلزم کی حامی عیسائیت، یہی نہیں بلکہ اس سے ان حضرات کی مرعوبیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے، ان پادریوں میں مشہور اور پیش پیش رہنے والے یہ ہیں:

رومن پادری ٹامٹ، فرانسیسی مفکر اور پادری سینٹ سائمن، برطانیہ کے سرکاری گرجا کا پادری موریس، کنگلے، نیز لارڈ بشپ ویسٹ کاٹ وغیرہ پیش پیش ہیں۔

چہ جائے کہ اہل مذاہب ان نظریات کو مذہب کی کسوٹی پر جانچتے، انھوں نے خود ہی ان سے مفاہمت کرلی، گویا کہ ان حضرات نے دانستہ طور پر اپنے مذہب کو ان نظریات پر قربان کر دیا، یہ بات قابل غور ہے کہ کہاں تو مذہب کے علمبردار جن کر یورپ کے اہل مذاہب نے وہ سب کچھ کر ڈالا جس پر آج یورپ کے دانشور شرمندہ ہیں، اور کہاں اس دور میں اسی طبقہ نے مذہب کے لبادہ کو اتار پھینکا، اور ہر اس فکر و نظریہ سے جو فطرت و عقل کے خلاف تھا مفاہمت کرلی، اور اس کو مذہب کا جزء بنا دیا، اصل میں حقائق سے انحراف کا نتیجہ عموماً افراط و تفریط ہوتا ہے، یورپ اسی صورت حال سے دوچار ہوا، بقول عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم کے "مسیحیت کا چنگل جب تک مضبوط رہا، یورپ جہل و جمود کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا، لیکن مسیحیت کو بالائے طاق رکھ کر جب یورپ نے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں حیرت انگیز ترقی کی تو دنیا انگشت بدنداں رہ گئی[۱]"

اور چونکہ یہ فکر ردعمل کی وجہ سے سامنے آیا، اس لیے اس کے منفی اثرات لازمی تھے، چنانچہ

[۱] العلم و العلماء: ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی، ندوۃ المصنفین دہلی طبع اول ۱۹۵۳ء ص ۷۔

اس دور میں ہر وہ فکر مقبول ہوا جس کی بنیاد مذہب و اخلاق پر نہ تھی، یہ ہے یورپ میں عقلیت کے آغاز کا سبب، محرکات و عوامل جو کچھ ہوں، لیکن جب ردعمل کے طور پر کوئی چیز نمودار ہوتی ہے تو منفی اثر سے خالی نہیں ہوتی، یہ لوگ مذہب کے اندر شامل ہوجانے والی غلطیوں کی اصلاح و تطہیر کے بجائے اہل کلیسا کے مظالم سے گھبرا کر مذہب ہی سے متنفر ہوگئے، یہ الگ مسئلہ ہے کہ مذہب کی تطہیر کا نتیجہ کیا نکلتا، اس لیے کہ مذہبی ادب کا ماخذ اگر علم و عقل کی کسوٹی پر مشکوک ہوجائے تو پھر روایات کام نہیں کرتیں، اس لیے کہ ان کے سہارے جو چیزیں آگے بڑھتی ہیں ان کا انجام وہی ہوتا ہے جو مذہب کے ساتھ یورپ میں ہوا۔

ہندو مذہب | اب آیئے ہندو مذہب کو دیکھیں کہ ہندوستان میں اس مذہب نے یا اس مذہب کے ماننے والوں نے کیا کیا، اور اپنی تہذیب و ثقافت کے نقوش کس شکل میں چھوڑے، اور ان کا سماج نئے مسائل و افکار سے دوچار ہوا تو انھوں نے اپنے سماج کو اور اپنے ماننے والوں کو کس طرح کی فکر دی، ایسے مواقع قوموں کی تاریخ میں اکثر آتے ہیں جو بہت اہم اور نازک ہوتے ہیں، اور اسی وقت قوم کے مصلحین یا مفکرین جمود و تعطل سے اپنے معاشرہ کو بچاتے ہیں۔

بلاشبہ ہندو مذہب دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ہے، گو اس کی ابتداء کا علم نہیں ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کو اس کی بنیاد مانا جاتا ہے، اس وقت سے یہ مختلف حالات سے دوچار اور ہر دور میں ایک نئے روپ کے ساتھ جلوہ گر ہوتا رہا، ہندو مورخین خود کہتے ہیں کہ ان کی قدیم تاریخ غیر محفوظ ہے، پنڈت نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند میں اس کا اعتراف کیا ہے، وہ ایک جگہ بہت ہی صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ،

" مختلف مذہبوں کے صحیفوں کا جائزہ ہم کس طرح لیں، عام طور پر لوگوں کا عقیدہ ہے

کہ یہ صحائف آسمانی ہیں، اگر کوئی ان صحیفوں کو انسانی ذہن کی پیداوار سمجھ کر ان کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرنے لگے تو عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی، پھر بھی ان کی جانچ پڑتال کا اور کوئی صحیح طریقہ نہیں[1]۔

مجھے ہمیشہ مذہب کی کتابیں پڑھنے میں تامل رہا ہے، ان کتابوں کی ہمہ گیری کے جو دعوے کیے جاتے ہیں وہ میرے دل کو کبھی نہیں لگے، اور مذہبی عمل کے جو نمونے میری نظر کے سامنے آئے انھوں نے مجھے اصل ماخذوں کی طرف رجوع کرنے کا شوق نہیں دلایا[2]؛

ہندو مذہبی ادب دو[3] حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ ہندو روایات کا ہے جو عرصے کے بعد سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کے بعد کتابی شکلوں میں مدون ہوا، جسے وید کے نام سے پکارا جاتا ہے، دوسرا حصہ وہ ہے جو روایات کے طور پر آباء و اجداد کے ذریعہ محفوظ کیا گیا، اس حصہ میں وہ مذہبی تعلیمات، قوانین اور تاریخی واقعات شامل ہیں جو ہندو اکابر نے اپنی آئندہ نسلوں تک پہونچائیں، یہ مذہبی ادب ویدوں کے علاوہ تمام دوسری کتب پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر تاراچند بیان کرتے ہیں کہ " ویدک دور ہندو مذہب کا وہ دور ہے جہاں نہ برہمن کی بالادستی ہے اور نہ کوئی اونچ نیچ ہے، نہ دیوتاؤں کے اقسام، بلکہ ہر شخص کا دیوتا اس کے پاس ہے[3]، اور اسی وجہ سے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی ہندو مذہبی تاریخ کو جس میں پہلا دور ویدک دور ہے، دوسرا برہمن دور اور تیسرا اصلاحی دور ہے۔

۱؎ تلاش ہند، جواہر لال نہرو ج ۱ مکتبہ جامعہ نئی دہلی مطبوعہ ۱۹۳۶ء، ص ۱۳۹ ۲؎ حوالۂ سابق، ص ۱۳۹ ۳؎ ڈاکٹر عبدالرشید: ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ ص ۱۰۶۔

اوپر گذر چکا ہے کہ آریہ قوم کی آمد ہندوستان میں ہندو مذہب کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنی، اس قوم کی آمد نے نئے نئے سیاسی اور جماعتی مسائل پیدا کر دیئے[۱]، ہندوستان میں ذات پات، آریا اور غیر آریا کی گہری تقسیم شروع ہوئی[۲]، اس تنظیم میں آگے چل کر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئیں، اور یہ آج ہمارے لیے بہت بڑی لعنت ہے[۳]، اسی احساس برتری اور تفوق کے نتیجے میں شمالی ہند کے باشندے جنوب کی طرف ڈھکیلے گئے، اور ان کو شودر کہا گیا، اور سب سے کم تر درجہ ان کو دیا گیا، اس کے برعکس برہمن قوم کو سب سے اہم مقام پر بیٹھایا گیا، جس کی وجہ سے پورے معاشرہ میں ہمیشہ سے ظلم و بربریت کی داستانیں رونما ہوتی رہیں، اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو "ہندوستانی تاریخ کے ہر دور میں بڑے بڑے لوگوں نے پروہتوں کے اثر اور ذات پات کے نظام کی سختی کے خلاف بار بار احتجاج کیا، اور ان دونوں چیزوں کے خلاف زبردست تحریکیں پیدا ہوئیں، پھر بھی اس نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے شکنجہ میں جکڑا ہوا پایا ہے[۴]"

جین مت پرانے مذہب کے خلاف ایک بغاوت تھی، بدھ مت نے براہ راست ذات پر حملے نہیں کیے، اس نے یہ کیا کہ اپنے سلسلہ میں اسے کوئی جگہ نہیں دی، اور ان کے سادے طرز عمل نے ذات پات کے نظام کو کمزور اور کھوکھلا کر دیا[۵]۔

آپ جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا، یہی کہ جب اس نے ذات پات سے رواداری برتی، اس نے اپنی نظر اور فکر کو نسبتاً زیادہ آزاد رکھا تو اسے ہندوستان سے چلا جانا پڑا[۶]، یعنی اس کا زوال آگیا۔

ذات پات اور برہمنوں کے تسلط کے خلاف جو کتابیں لکھی گئیں، ان ہی کو اصلاحی

۱؎ تلاش ہند اول ص ۱۵۴ ۲؎ ایضاً ۱۵۵ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ص ۲۲۵ ۵؎ ایضاً ص ۲۲۴ ۶؎ ایضاً ۲۶۵

تحریک سمجھنا چاہیے، اس سلسلہ میں اپنشد سب سے اہم اور بنیادی کتاب ہے، لیکن اس کی تدوین کا کوئی متعین زمانہ معلوم نہیں ہے، اس کا شمار وید کے دوسرے حصہ میں ہوتا ہے، اس کے برعکس منو نے شاستر لکھ کر برہمن فرقہ کی بالا دستی اور شودر فرقہ کی بے وقعتی کو واضح کیا ہے، ان کا مرتبہ ہندو مذہب میں بہت اہم ہے، اور ان کو ہندو مذہب کا مبلغ اور قانون داں کہا جاتا ہے،

رامائن کے ذکر سے پہلے یہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے کہ عام ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق اصل دیوتا تین ہیں: برہما، وشنو اور شیو، یعنی برہما پیدا کرتا ہے، وشنو پالتا ہے، اور شیو فنا کرتا ہے، اکثریت کا عقیدہ یہ ہے کہ وشنو کے دس اوتار ہیں، اور رام چندر جی ساتویں اوتار ہیں، رام چندر جی کے قصہ کو والمیک نے ایک ضخیم کہانی بنا کر پیش کیا ہے، اسی کو رامائن کہتے ہیں، بعد میں اسی کہانی کو تلسی داس نے آسان زبان میں پیش کیا ہے، اس کو تلسی داس کی رامائن کہتے ہیں، رام چندر جی کے پورے کردار کو موجودہ دور کے ہندو محققین نے مہمل، بے بنیاد اور صرف خرافات کے نام سے یاد کیا ہے[۱]۔

جہاں تک ہندو مذہب کی تاریخ کے غیر محفوظ ہونے کا سوال ہے اس پر خود ہندو علماء متفق ہیں[۲]،

اس جگہ یہ بتا دینا بے محل نہیں ہے کہ اسلامی تعلیمات کو خود مسلم محققین اور علماء نے جس انداز سے جانچا اور پرکھا اس کی مثال دنیا کی کوئی قوم یا کوئی مذہب نہیں پیش کر سکا، اسلام کا اولین سرچشمہ خدا کا الہامی کلام ہے، اس کو جانچنے کا یہ معیار و انداز رہا کہ اس جیسا ایک کلمہ کوئی اور پیش نہیں کر سکتا، دوسرا بنیادی سرچشمہ احادیث و روایات ہیں، جن کو درایت کی کسوٹی پر پرکھا، خصوصیت کسی قوم و مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی،

۱؎ Dr. R.L. Shukla, Ramjanam Bhoomi: A. Myth or Reality

۲؎ تلاش ہند ص ۱۳۹ .

ہندو مذہب کو بدھ مت اور جین مت کے اثرات سے نکالنے کے لیے مصلحین نے بڑی کوشش کی[1]

اسلام | جب اسلام ہندوستان میں آیا تو یہ بھی ہندوؤں میں مذہبی مصلحین اور ان کی اصلاحی تحریکوں کے پیدا ہونے کا باعث بنا، چنانچہ ہندو مصلحین نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر ہندو مت میں اصلاح و تصحیح کا بیڑا اٹھایا، ان لوگوں کی یہ اصلاحی تحریکیں ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد شروع ہوئیں[2]۔ اسی وجہ سے ہندو مصلحین کی تعلیمات میں اسلامی تعلیمات کا پرتو نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

ہندو مذہب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ بہت جلد دوسرے مذاہب کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے، اور اس طرح دوسرے مذاہب کے اثر و نفوذ کو ختم کر دیتا ہے[3]، چنانچہ بدھ مت اور جین مت کو اس نے اپنے اندر جذب کر لیا، لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام کو ہندو مذہب اپنے اندر کیوں جذب نہیں کر سکا، اس کی وجہ درایت کو روایت پر فوقیت دینا، تاریخیت اور اسلام کا الہامی مذہب ہونے کا دعویٰ جس کا جواب آج تک دنیا نہ دے سکی، اگر اسلام کی یہ صورت نہ ہوتی تو انجیل کی طرح قرآن میں بھی حذف و اضافہ ہوتا رہتا[4]، اور ہندو ازم کی طرح اس کی بھی کوئی متعین تاریخ نہ ہوتی۔ گویا اسی تاریخی تعین نے اسلام کو محفوظ رکھنے کا ایک اہم کردار ادا کیا، ہندوستان میں اسلام کی آمد کا بہت ہی اچھا اثر پڑا، اور ہندو قوم نے اس کی خصوصیات کو اپنانے اور اپنے اندر اس کو جذب کرنے کی کوشش کی، مگر اسلام سے ٹکراؤ کی صورت نہیں ہونے پائی، بلکہ اسلام نے اپنا ذاتی وصف برقرار رکھتے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر عبد الرشید : ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۱۲۷ -
[3] ایضاً ص ۱۲۸ [4] ایضاً ص ۴۱۹ -

اس پر اثر ڈالا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا پہلا اور اولین سبب عربوں اور ہندوؤں کا تجارتی میل جول ہے، جس کا آغاز اسلام سے بہت پہلے ہو چکا تھا[1]، اور یہی تاجر ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سب سے پہلے داعی اور مبلغ ہیں[2]، ترکوں نے ہندوستان پر حملہ کیا، یا ان سے پہلے سندھ پر محمد بن قاسم نے جب حملہ کیا تو اس وقت مسلمان اور اسلام یہاں کے باشندوں کے لیے نیا نہ تھا، اس زمانہ میں ہندو سماج میں چھوت چھات کی بیماری عام تھی، نیز اس زمانہ میں چونکہ بودھ مت کا زوال شروع ہو گیا تھا، اور برہمن فرقہ جین اور بدھ کے اثرات کو ختم کر چکا تھا بلکہ ان کو اپنے اندر جذب کر چکا تھا، اسی لیے معاشرہ پھر ویسا ہی ہو گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملہ کو لبیک کہا گیا اور محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کا باشندوں کی شکایت پر کیا تھا[3]، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب محمد بن قاسم سندھ سے واپس جانے لگا تو اس کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے وہاں کی رعایا نے آنسو بہائے، اور اس کی یاد میں ایک مجسمہ نصب کیا[4]۔

یہاں عقیدہ اور رسم و رواج کے فرق کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، عقیدہ بہت دیر میں بدلتا ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اور رسم و رواج کا تعلق ماحول سے ہوتا ہے، جس میں باہمی ربط سے اضافہ ہوتا ہے، مسلم حکمرانوں نے کبھی یہاں کے باشندوں کے عقائد سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس کے برعکس یہاں کے باشندے مسلمانوں کے رسم رواج سے ضرور متاثر ہوئے، اسلام کے ماننے والوں نے جو سلوک ہندوؤں سے کیا اس کی مثال

---

[1] مقالات سلیمان حصہ اول ص ۱۸۹، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۶۶ء۔ [2] ایضاً ص ۱۸۹ [3] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۵، سید سلیمان ندوی، ۱۹۷۶ء۔ [4] حوالہ مذکور ص ۱۶۔

ملنا بہت مشکل ہے، محمد بن قاسم سے یہاں کے برہمنوں نے ایک مخصوص درجہ اپنے لیے مانگا،
جو اس نے ان لوگوں کو دیا[1]، قدیم ہندوستان میں مذہبی حکومت کبھی نہیں ہوئی[2]، ہندوستان
کے اجتماعی نظام میں اس بات کی اجازت تھی کہ اگر بادشاہ ناانصاف اور جابر ہو تو رعایا اسکے
خلاف بغاوت کر دے[3]، اس کا ثبوت ہم کو بعد کے مسلم حکمرانوں کے طرز عمل سے ملتا ہے۔
شخصی حکمرانی کا تصور وانداز یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے بالکل مختلف تھا،
یورپ میں بادشاہ کو اپنی رعایا اور ان تمام چیزوں پر جو اس کی مملکت کے حدود میں تھیں
پورا پورا قبضہ واختیار حاصل تھا[4]، یہ اصل میں حکومت کے اس تصور کی ترقی یافتہ شکل تھی جسکی
ابتداء روما سے ہوئی تھی، ہندوستان میں اس قسم کا کوئی تصور نہ تھا[5]، اگر تھا تو ذات پات کا
زنار جو ہر طرح کے برے اور خراب تصور پر حاوی تھا، اور جس کے خلاف ہر دور میں اصلاحی
تحریکیں عالم وجود میں آئیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بہت اچھے اور عالمانہ انداز میں ہند
مسلم باہمی مفاہمت کے پس منظر کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

”مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ تھی جو ہر غیر قوم کے سایہ تک کو برداشت
نہ کرتی تھی، اور اس سے گریز کرتی تھی، اس کو ناپاک اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اس
وقت میں کوئی خیال کر سکتا تھا کہ کسی زمانہ میں ہندو قوم بھی اس قدر روادار اور وسیع
الخیال ہو جائے گی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل کر کام کرے گی، اور ان کی زبان سیکھیگی
اور اس کے علوم وفنون پڑھے گی، اس کے تمدن ومعاشرت کو اختیار کرے گی، اور اس کے
ساتھ شاگردی اور استادی کا رشتہ قائم کرے گی، لیکن سو دو سو برس کے اندر ہی خیالات

[1] عرب وہند کے تعلقات ص ۲۰۰، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۷۶ء۔ [2] تا [5] تلاش ہند حصہ اول ص ۲۹۱۔

میں بڑا انقلاب آگیا، اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریاں کرنے لگے، اور دربار میں
میں مسلمان ارباب کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے، یہی ابتدائی بے تعصبی ہندؤں
کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے...... اگر مسلمانوں کا درمیانی دور جس نے سو دو سو
برس کے اندر ہندوؤں کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا اور دوسری قوموں
کے علوم وفنون سیکھنے کی ان میں ترغیب پیدا کی، ہندوستان پر قائم نہ ہوا ہوتا تو کیا یہ
ممکن تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیتے“[1]

ابھی اوپر ذکر آچکا ہے کہ برہمنوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کے حریف بودھوں نے مسلمانوں
کے ساتھ مل کر کس قدر فوائد حاصل کیے ہیں، انھوں نے بھی اپنا ایک وفد بنایا اور محمد بن قاسم
کے دربار میں پہونچے، محمد بن قاسم نے ان کی قدر کی، لیکن برہمنوں نے یہ شرط پیش کی کہ
ہندو دستور کے مطابق ہمارا قومی درجہ دیگر ذاتوں سے بلند رکھا جائے، محمد بن قاسم نے
ان کے اس دعوی کی سچائی کی تحقیق کی، اور جب اس کے متعلق اس کو تشفی ہوگئی تو اس نے
ان کا اعزاز کیا، برہمنوں نے اس کا خاص شکریہ ادا کیا، اور گاؤں گاؤں جاکر نئے حکمرانوں
کے عدل وکرم کے گیت گائے، اور اپنے ہم مذہبوں کو اطاعت وفرماں برداری پر
آمادہ کیا، اور جو مساوات حقوق عربوں کی بدولت مہیا ہوئی تھی اس کی ہر جگہ تعریفیں کیں[2]“

یہاں اس طرف اشارہ کروں گا کہ بدلتی ہوئی دنیا میں ہندوستان کے برہمنوں نے
ہر حال اپنے مفادات کا تحفظ کیا، چاہے وہ مسلم حکمراں ہوں یا انگریز، اور فکری طور پر بھی نئی
چیز کو انھوں نے اپنے اندر داخل کیا، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ہندوستان
میں جب مسلمان آئے تو ہندوؤں کی اصلاح وتربیت کی طرف ان لوگوں نے توجہ دی تھی

[1] مقالات سلیمان ص ۱۰ [2] ایضاً ص ۲۲۲۔۲۲۳۔

یہ قوم مسلمانوں کے ساتھ حکومت میں برابر کی شریک رہی، اگر مسلمان اس طرف دھیان نہ دیتے تو علامہ سید سلیمان ندوؒی کا مذکورہ اقتباس محض مبالغہ معلوم ہوتا، مگر ان کا تجزیہ حقائق پر مبنی ہے۔

مسلمانوں کے برعکس جب انگریز یہاں آئے تو انھوں نے یہاں کے رائج نصاب و نظامِ تعلیم کو ختم کر دیا، جس کے نتیجہ میں ہندوستانی بے علم ہو گئے۔ نیز عہدِ سلطنت و عہدِ مغلیہ میں معلمین و متعلمین کے لیے وظائف اور عطیات جو دیے جاتے تھے اس سے اس طبقہ کی مستقل مالی اعانت ہوتی تھی، ۱۸۳۵ء میں اوقاف کی ضبطی سے مدارس تباہ و برباد ہو گئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان عرصۂ دراز تک برصغیر کے حکمراں رہے، اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ فراخ دلی کا معاملہ کیا، مگر انگریزوں نے بلا وجہ ان سے ہندوؤں کے مقابلہ میں ترجیحی سلوک اور عصبیت کا برتاؤ کیا[1]، جس کے نتیجہ میں ان دو اہم قوموں میں جو ایک طویل عرصے سے صلح و آشتی کی زندگی گذار رہی تھیں آپس میں منافرت پیدا ہو گئی، اور انگریز ہندوستان پر چھاتے چلے گئے، اس لیے ابتدا میں مسلمانوں نے انگریزی حکومت سے تعاون نہیں کیا، اور انگریز پہلے سے یہ طے کر چکے تھے کہ ہم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو آگے بڑھانا ہے، چنانچہ نئے علوم و فنون سے ہندوؤں نے مکمل استفادہ کیا، اور مسلمان اسے انگریز کا نشان سمجھ کر اس سے دور رہنے لگے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان نئے علوم و فنون میں اپنے ہم وطن ہندوؤں کے مقابلہ میں پیچھے رہ گئے، اس دور میں ایک بار پھر ہندو فرقہ میں اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا، جس کے روحِ رواں راجہ رام موہن رائے تھے، یعنی

[1] برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار" ص ۲۳، حافظ بابر خان، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد ۱۹۸۵ء۔

ہندوؤں میں انگریزی پڑھنے کی وجہ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

ویسے اس ملک میں عہدِ جدید کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انگریزوں کی حکومت کی بنیاد مستحکم ہو گئی، اور جدید مغربی تہذیب حکمراں طبقے کی تہذیب کی حیثیت سے ہماری زندگی پر گہرا اثر ڈالنے لگی[1]۔

ابھی ذکر آچکا ہے کہ انگریزوں کی پالیسی ہی کے نتیجے میں ہندو احساسِ برتری اور مسلمان احساسِ کمتری کا شکار ہونا شروع ہو گئے تھے، اور مسلمان انگریزوں سے اسی وجہ سے تعاون نہیں کر رہے تھے، اور انگریزی پڑھنے کو اور انگریزوں کے علوم و فنون کو انگریزی نشان سمجھ کر پیچھے ہٹ رہے تھے، ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرزِ عمل میں بہت فرق تھا، ہندوؤں نے بنگال میں کوئی چالیس سال پہلے ہی مغربی تعلیم کی طرف توجہ کر دی تھی، ۱۸۵۷ء کے بعد صوبہ جات شمالی و مغربی اور پنجاب میں بھی وہ خاصی مستعدی سے انگریزی اور جدید علوم سیکھنے لگے، گو مغربی تہذیب کے دوسرے پہلوؤں سے وہ زیادہ متاثر نہیں ہوئے، مگر مسلمان بحیثیت جماعت انگریزی حکومت اور مغربی تعلیم و تہذیب سے سخت بیزار تھے، اس لیے نئے دور کے ساتھ جواب شروع ہو رہا تھا، ان کا انداز سراسر مخالفانہ تھا[2]"

اسی زمانہ میں پادری فنڈر اور دوسرے مسیحی مبلغین اور پادریوں کی ایک جماعت جو اس چیز کا بیڑا اٹھا کر ہندوستان آئی تھی کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت یہاں اس طرح کرے کہ اسلامی سلطنت کے زوال کے ساتھ اسلام بھی مغلوب ہو، اور مذہب عیسوی کے

[1] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں"، سید عابد حسین، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۵ء ص ۲۷ [2] ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ص ۲۸۔

غلبہ اور اقتدار کے ساتھ مسیحیوں کو بھی غلبہ واقتدار ہندوستان میں حاصل ہو۔

چنانچہ اس طرز فکر کا مقابلہ اس دور کے علماء نے کیا جس میں سب سے مشہور مولانا رحمت اللہ کیرانوی مرحوم ہیں، جنھوں نے اس مسیحی عالم سے تین دن مناظرہ کر کے یہ بات ثابت کر دی کہ انجیل جس پر آج کل عیسائیوں کا اور پادریوں کا عمل ہے تحریف شدہ ہے، ان کے جواب میں فاضل مسیحی مناظر سے بجز سر تسلیم خم کرنے کے اور کچھ نہ بن پڑا، اور حکم کے طور جو مسلمانوں کے علاوہ تھے، انھوں نے عیسائیت کے خلاف فیصلہ کیا، اس مناظرہ کی روداد جب انگریزی میں ۱۸۵۱ء میں ترجمہ کی شکل میں منظر عام پر آئی، تو لندن ٹائمز نے اس پر لکھا کہ اگر اس کتاب کو لوگ پڑھیں گے تو مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی[1]، یہ واقعہ ۱۸۵۷ء سے چار سال قبل کا ہے، ویسے در پردہ انگریزوں نے عیسائی مبلغوں کی بڑی مدد کی، نیز ہندو تو انگریزی علوم و فنون پڑھنے ہی لگے تھے، جبکہ مسلمان بالکل پیچھے ہوتے جا رہے تھے۔

جب مشہور زمانہ غدر ختم ہو گیا تو مسلمانوں کو شدت سے اس کا احساس ہوا کہ حکومت ختم ہو چکی ہے، صنعت و حرفت پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی، جائداد ضبط کی جا چکی تھی، سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی قرار دی جا چکی تھی، ہندوؤں کو بڑھانے کی پالیسی پر مدت سے عمل کیا جا رہا تھا، مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی چیزیں نظام تعلیم کا جزء بنائی گئی تھیں، اس طرح ان کو جدید تعلیم سے روکا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس وقت وہ ملازمت سے محروم تھے[2]، عام طور پر مسلمان ہی غدر کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے، بے شمار مسلمانوں کو جن پر غدر میں کسی صورت سے حصہ لینے کا ہلکا سا بھی شبہ تھا پھانسی دے دی گئی۔

بنگال کی طرح شمال مغربی صوبے اور پنجاب میں انگریز حکمراں مسلمانوں کو سرکاری

---

[1] ..... [2] .....

ملازمت سے الگ کر کے ان کی جگہ ہندوؤں کو رکھنے لگے، اور اس کے جواز کے لیے اس بات کو بنیاد بنایا گیا کہ مسلمان عام طور پر انگریزی سے، جو سرکاری زبان بن چکی ہے ناواقف ہیں، ظاہر ہے کہ حکومت کے اس طرز عمل کی وجہ سے مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں کو خاص طور پر بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے ان میں شدید اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

اس ناگفتہ بہ حالت میں مسلمانوں کے اہل فکر اور دور اندیش لوگوں کے لیے یہ بڑا مسئلہ تھا، کہ وہ اصلاح حال کے کام کا آغاز کہاں سے کریں، اور آیندہ کے لیے کیا طریقۂ عمل اختیار کریں؟ اس پسماندگی کی فضا میں بنگال میں نواب عبد اللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی، اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مطالعہ پر آمادہ کیا جائے، تاکہ وہ انگریزوں سے قریب آئیں، انگریزی حکومت کی ملازمت اور ان آزاد پیشوں میں حصہ لے سکیں جن کے لیے انگریزی تعلیم لازمی ہے، اس کے لیے نواب عبد اللطیف نے علماء سے جن میں وہابی تحریک کے ایک ممتاز رہنما مولوی کرامت علی جون پوری بھی شامل تھے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دار الحرب نہیں ہے، اس کے خلاف جہاد کرنا جائز نہیں[1]

مگر یہ تحریک اپنے مقاصد کے لحاظ سے بھی محدود تھی، اور اپنے دائرۂ عمل کے لحاظ سے بھی[2]، اسی زمانہ میں شمالی ہند میں مذہبی، تہذیبی، سیاسی اصلاح و ترقی کی ایک ہمہ گیر تحریک سر سید احمد خان نے شروع کی، ان کی تحریک نے پورے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے حلقہ میں لے کر ان میں ذہنی انقلاب پیدا کر دیا، مگر سر سید احمد خان کے بارے میں علماء کے ایک طبقہ نے کچھ دوسرے انداز سے اظہار رائے کیا ہے، یہاں تک کہ انھیں انگریزوں کا ایجنٹ بھی سمجھا گیا، اگر وہ اپنا دائرۂ کار صرف انگریزی تعلیم کی طرف رغبت دلانے

---

[1] [2] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ص ۳۵، ڈاکٹر سید عابد حسین۔

ہی تک محدود رکھتے اور یہ بتاتے کہ انگریزی نہ پڑھنے سے اب تک مسلمانوں کو کیا کیا نقصان ہوا ہے، اور آیندہ کیا ہوگا تو وہ طبقۂ علماء کے اعتراض کا نشانہ نہ بنتے، مگر جب انھوں نے مذہب کی توجیہ کا وہ انداز اختیار کیا جو مسلمانوں کے سواد اعظم کے خلاف تھا، تو ان کی بڑی مخالفت کی گئی، مگر اس میں شبہہ نہیں کہ سرسید نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا، اس سے مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول اور مفاہمت کا ماحول پیدا ہوا، جو ان کی ناقابل فراموش ملی خدمت ہے،

قوموں کی زندگی میں اس طرح کے حالات پیش آتے رہتے ہیں، جب ان کو نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسلامی تاریخ میں بھی شروع ہی سے اس کی مثالیں ملتی ہیں، اگر فتنۂ ارتداد ہی کو سامنے رکھا جائے تو مسائل کی تہ تک پہونچنا بہت آسان اور سہل ہو جائے گا، اس سے بھی اہم واقعہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا ہے، اس وقت حضرت عمرؓ نے تلوار نکال لی تھی کہ اگر کسی نے کہا کہ آپؐ کا وصال ہو گیا ہے تو میں اس کی گردن ماردوں گا، اس عجیب وغریب وقت میں حضرت ابو بکرؓ نے جب سورۂ آل عمران کی آیت پڑھی، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسا لگتا ہے کہ میں نے ان قرآنی آیات کو آج ہی سنا ہے[1]، اور اس طرح حضرت ابو بکرؓ نے حالات پر قابو پایا، جب کہ صورت حال اس طرح تھی کہ جس کا پس منظر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا، تو منافقوں نے سر اٹھایا، عرب مرتد ہو گئے اور یہود و نصاریٰ چوکنا، مسلمانوں کی حالت اپنے نبیؐ کی وفات سے ایسی زبون ہوئی جیسی ان بکریوں کی جو جاڑوں کی راتوں میں بارش سے بھیگیں، حتی کہ خدا کے حکم سے انھوں نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا، خلافت کی ایسی سنگین

---

[1] سورۂ آل عمران: ۱۴۴۔

ذمہ داریاں میرے والد کے سر پر آپڑیں کہ اگر پہاڑ ان کو اٹھاتے تو ٹوٹ جاتے، بخدا جس بات پر مسلمانوں میں اختلاف ہوتا میرے والد خوش اسلوبی سے دور کرتے[1]،

غور کیجیے کہ ایسے ابتر حالات میں بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ہوش و توازن پوری طرح قائم رہا، اور انھوں نے قرآن و حدیث ہی کی جانب رہنمائی کیلیے نگاہ اٹھائی اور انہی کی روشنی میں کام کیا، حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے ان کا رخ موڑ دیا، جب کہ حضرت عمرؓ جیسا آدمی بھی انہیں لڑائی سے باز رہنے اور مصالحت آمیز رویہ اپنانے کے لیے اصرار کر رہا تھا، مگر ان سب باتوں کے جواب میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، "بخدا ان لوگوں سے میں ضرور لڑوں گا جو زکوۃ اور نماز میں فرق کرتے ہیں"، ان کے اس استقلال و عزیمت کا اعتراف بعد میں خود حضرت عمرؓ نے بھی کیا کہ "بخدا ابو بکرؓ کی ایمانی قوت سب عربوں کے ایمان سے بڑھی ہوئی تھی[2]"!

عربوں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ اگر محمدؐ نبی ہوتے تو کبھی نہ مرتے، ایک دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ ان کی موت سے نبوت ختم ہو گئی اور ان کے کسی جانشین کی اطاعت ہم پر لازم نہیں، ایک تیسری جماعت کہتی تھی کہ ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایک چوتھی جماعت کہتی تھی کہ ہم کو خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت تسلیم، ہم نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن زکوۃ نہیں دیں گے، ابو بکرؓ نے کہا: "ہم لڑیں گے" اور کسی کی کوئی دلیل نہیں مانی، اس بارے میں اکابر صحابہؓ سے مشورہ بھی ہوا اور بحث و مباحثہ بھی ہوا، صحابہ میں عمر فاروقؓ، ابو عبیدہؓ بن جراح اور سالمؓ مولیٰ ابو حذیفہؓ سب سے زیادہ حضرت ابو بکرؓ پر نکتہ چین تھے، انھوں نے کہا کہ "اسامہؓ ابن زید کی مہم کو روک دیجیے، تاکہ ان کی فوج مدینہ میں رہے، اور شہر کے لوگ باغی عربوں کی یورش سے محفوظ رہیں، اور جب تک موجودہ آزمائش ختم نہ ہو آپ عربوں سے

---

[1] تاریخ ردہ ص ۱۹ (خورشید احمد فارق) [2] ایضاً ص ۲۰۔

ساتھ نرمی سے پیش آئیں، اس وقت صورت حال بے حد سنگین ہے، کوئی ایک قبیلہ اگر باغی ہو جاتا تو ہم کہتے کہ وفادار عربوں کو ساتھ لے کر ان کا مقابلہ کیجیے، لیکن اس وقت تو سارا عرب ارتداد کی زد میں ہے، ان کی اکثریت یا تو ترکِ اسلام کر چکی ہے یا زکوٰۃ دینے سے منکر ہے، یا گو مگو کی حالت میں ہے، کبھی ایک قدم آگے کبھی ایک قدم پیچھے، اور منتظر ہے کہ آپ دشمن سے کیسے نمٹتے ہیں[1]۔

ان سب باتوں کو سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابۂ کرامؓ کی جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے ان سارے معاملات میں جن میں قرآن و رسولؐ دونوں خاموش ہیں آپ حضرات سے ہی مشورہ لیا جاتا رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو کسی غلط طریق کار پر متفق نہیں کرے گا، میں آپ کو ایک رائے دیتا ہوں، میں آپ ہی میں سے ایک ہوں، آپ اپنی اور میری دونوں کی رائے پر غور کر کے صحیح طریق کار اختیار کیجیے، خدا ضرور آپ کی رہنمائی کرے گا۔ میری رائے یہی ہے کہ باغیوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے، ان میں سے جس کا جی چاہے مسلمان ہو اور جس کا جی چاہے کافر رہے، یہ مناسب نہیں کہ ہم اسلام پر قائم رہنے کے لیے کسی کو رشوت دیں، بلکہ ہم کو چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سامنے رکھ کر خدا کے دشمنوں سے لڑیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑتے تھے، بخدا اگر عرب زکوٰۃ کے اونٹ کا بندھن تک روکیں تو میری رائے یہ ہے کہ ان سے لڑوں اور بندھن وصول کر دوں، باہمہ مشورہ کر لیجیے، خدا آپ کی رہنمائی کرے گا، رہا عیینہ اور اس کے ساتھیوں کا وفد تو وہ خود اپنے قبیلے کے ساتھ بغاوت میں شریک ہے، بلکہ اس نے بغاوت کو شہ دی ہے، ان کے سامنے اگر تلوار سونت لی جائے تو ان کی عقل درست ہو جائے گی، وہ اسلام کے وفادار بن جائیں گے، اور اگر مارے گئے

[1] تاریخ ردہ ص۱۲۳ خورشید احمد فارق۔

تو جہنم رسید ہوں گے، صحابۂ کرام نے آپ کی بات سن کر آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

اسلام کے ماننے والوں کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو نہ اپنے لیڈر کے مرنے سے ختم ہوتی ہے، اور نہ اس میں تبدیلی آتی ہے، مزید براں یہ تحریک ایسی بھی نہیں کہ صرف اپنے ماننے والوں سے عبادت کی حد تک سروکار رکھے، بلکہ معاملات میں بھی راہ دکھاتی ہے، بلاشبہ فتنۂ ارتداد کا تدارک اعتصام بکتاب اللہ و سنت رسولؐ کو لائحۂ عمل بنائے بغیر کیا گیا ہوتا[1] تو آج اسلام کس شکل میں ہوتا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

اصل میں ہر زمانہ کے فتنوں کا تدارک اس وقت کے مفکرین امت نے کیا، سماج اور تاریخ کے مطالعہ سے کوئی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ معاشرہ کبھی ایک وضع پر نہیں رہتا، البتہ ہر دور میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے فکری جمود اور زوال پذیر معاشرہ کو از سرِ نو کتاب و سنت کو لائحۂ عمل بنانے کی دعوت دی، مزید براں نئے مسائل کی توجیہ و تشریح صرف کتاب و سنت سے کر کے معاشرہ کو ایک نئی زندگی دی۔

اس کے بعد سب سے اہم دور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ہمارے سامنے آتا ہے انھوں نے اپنے گھرانہ و خاندان کی اصلاح کے بعد نظام حکومت کی طرف توجہ دی اور کتاب و سنت کو نمونہ و مثال بنایا، انھوں نے قرآن کی اس آیت اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ الخ کی مکمل پیروی کر کے آنے والی نسل کے لیے مثال قائم کر دی، ان کے انتقال کی خبر سن کر قیصر روم نے ان کے بارے میں یہ تاریخی الفاظ کہے تھے "اگر کوئی راہب دنیا چھوڑ کر اپنے دروازے بند کرے اور عبادت میں مشغول ہو جائے تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، مگر مجھے حیرت ہے تو اس شخص پر جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی اور پھر اسے ٹھکرا کر اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی[2]۔

[1] یہ اشارہ اس حدیث کی طرف ہے لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ و سنتی [2] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر طبع دوم ص ۷۹۔

عمر بن عبدالعزیزؓ کا اس جگہ اور اس پس منظر میں ذکر اس وجہ سے ضروری ہے کہ انھوں نے جب حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو ہر طرف فساد ہی فساد تھا، اور اس کا ذمہ دار خود ان کا گھرانہ تھا، ذاتی اغراض و عصبیت کا زور اس قدر عروج پر تھا کہ مذہبی اور اخلاقی قدریں پامال ہو کر رہ گئی تھیں جس سے سب سے زیادہ فائدہ ان کے خاندان کو پہونچ رہا تھا، لہٰذا ان کو سب سے پہلے اپنے خاندان والوں ہی سے نبرد آزما ہونا پڑا، چنانچہ آپ کا خاندان ہی آپ کا دشمن ہوگیا، آپ کو صرف ڈھائی سال کام کرنے کا موقع ملا، اور اس مدت میں انھوں نے فکری سطح پر ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا، آخر کار آپ کے گھر ہی والوں نے زہر دے کر یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اس لیے کہ اسلام کے مطابق زندگی گذارنے میں ان لوگوں کی موت تھی[1] ان کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب وہ حکمراں ہوئے تو جزیہ کی آمدنی اتنی گھٹ گئی کہ سلطنت کے مالیات اس سے متاثر ہو گئے[2]۔

یہ اس بات کی طرف صریح اشارہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے زمانہ تک ان لوگوں سے جزیہ کی وصولیابی بند ہو گئی تھی جن کو مسلمان ہونے کے بعد بھی جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا، یہ تاریخ اسلام کا ایک شرمناک باب ہے کہ حکمراں خلفاء نے اپنے تعیش کی خاطر حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ سے پہلے اور پھر فوراً بعد ان لوگوں سے جزیہ وصول کیا جو اسلام لا چکے تھے تاکہ قومی خزانہ سے ان کی زندگی کی فضول خرچیاں پوری ہوتی رہیں، بہر حال اس ڈھائی سالہ زندگی میں عمر بن عبدالعزیزؓ نے جو جو اصلاحات کیں اور اس معاشرہ کو جو اپنے تمدن کو بھول چکا تھا پھر سے بتایا کہ تمھارے تمدن کی اساس کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے شاہان بنو امیہ نے جن جاگیروں سے اپنے گھر والوں اور خاندان والوں کو مالا مال کیا تھا ان میں سے ان کا اور ان کے گھر والوں کا بھی بہت بڑا

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر طبع دوم ص ۹، [2] ایضاً۔

حصہ تھا حتی کہ ان کی ذاتی جائدادوں سے پچاس ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی، مگر انھوں نے تمام جاگیریں جو شاہی خاندان کے قبضہ میں تھیں اپنی جاگیر سمیت بیت المال کو واپس کیں اور جن جن کی زمینوں اور جائدادوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا، وہ سب ان کو واپس دلا دیں اس تغیر سے ان کی اپنی ذات کو جو نقصان پہونچا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے ان کی سالانہ آمدنی صرف دو سو رہ گئی۔

عمر بن عبدالعزیزؓ کے بعد کچھ عرصہ تک ان کی اصلاحات کا اثر معاشرہ پر رہا، مگر آخر کار جو ہونا تھا وہ ہوا، ایک بار پھر پورا معاشرہ جاہلیت کی آغوش میں جا پڑا جس کی تمام تر ذمہ دار حکومت ہی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے بعد کے دور میں دوسری قوموں سے باہم میل جول کے نتیجہ میں لوگ ایک دوسرے کے افکار و خیالات اور علوم و فنون سے بھی واقف ہوئے مگر اس لین دین اور علمی و ثقافتی تبادلہ کے نتیجہ میں غیر قوموں کے عقائد و افکار سے مسلمان متاثر ہوئے، معاشرہ کے فکری انحطاط کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں افکار و عقائد کے جال میں پھنس کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں، اپنی فکری اساس بھول جاتی ہیں، یہاں تک کہ اپنے تہذیب و تمدن کو بھی شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہیں، ان حالات کا مقابلہ نہ کرنے کی صورت میں قوموں کی موت خود بخود ہو جاتی ہے، امام غزالیؒ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے چیلنج کا مقابلہ کیا، اور پوری امت مسلمہ کو ذہنی افلاس و پسماندگی سے ہمیشہ کے لیے بچایا، ان کے دور میں قوم کو نئے نئے حالات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اور فلسفۂ یونان کی اشاعت نے عقائد کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں[1]، یہ امام غزالیؒ کے دور کا بہت بڑا چیلنج تھا جس کا انھوں نے مقابلہ کیا، اور اسلام کے عقائد اور اساسیات کی ایسی معقول تعبیر پیش کی

[1] الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، طبع دوم ص ۸۔

جس کی اس وقت ضرورت تھی، اس کام کو کرنے کے لیے انھوں نے فلسفۂ یونان کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس کے نقائص واضح کیے، ان کی تنقید سے وہ رعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا کم ہوگیا، اور لوگ جن یونانی عقائد و نظریات کو حقائق سمجھ بیٹھے تھے جن پر قرآن و حدیث کی تعلیمات کو منطبق کرنے کے سوا ان کے نزدیک دین کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی ان کی اصلیت سے بڑی حد تک آگاہ ہوگئے،[1] امام صاحبؒ کا ایک اصلاحی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ان غلطیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جو فلاسفہ و متکلمین کی ضد میں خود اسلام کے وہ حمایتی کر رہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے۔

اس کے بعد امام غزالی نے دین کے فہم و ادراک کا صحیح شعور عطا کیا، تقلید جامد کی سخت مخالفت کی، لوگوں کو کتاب و سنت رسولؐ کے چشمۂ فیض کی جانب متوجہ کیا، اجتہاد کی روح کو تازہ کرنے کی کوشش کی اور اپنے عہد کے تقریباً ہر گروہ کی گمراہیوں اور کمزوریوں پر تنقید کر کے اصلاح کی عام دعوت دی، ہر طبقہ کی اخلاقی و عملی برائیوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیں، اور ان کے نفسیاتی اور تمدنی اسباب کا کھوج لگایا، اس کا ثبوت ان کی شہرۂ آفاق کتاب احیاء العلوم[2] ہے۔

ان کے بعد امام ابن تیمیہؒ نے اپنے زمانہ کے حالات کا مقابلہ کیا، اگرچہ یہ امام غزالیؒ کے ڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہوئے، مگر انھوں نے یونانی منطق و فلسفہ پر امام غزالیؒ سے بھی زیادہ گہری تنقید کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا، انھوں نے اسلام کے عقائد، احکام اور قوانین کی تائید میں ایسے زبردست دلائل قائم کیے جو امام غزالیؒ کے دلائل سے زیادہ معقول اور وزن دار تھے، امام غزالیؒ کے بیان و استدلال پر اصطلاحی معقولات کا اثر تھا، امام ابن تیمیہؒ نے اس کو چھوڑ کر عقلِ عام پر تفہیم کی بنیاد رکھی جو زیادہ موثر ثابت ہوئی،[2] انھوں نے تقلید جامد کے خلاف آواز

۱؎ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، طبع دوم ص ۴۴ ۲؎ ایضاً ص ۸۷۔

ہی نہیں اٹھائی بلکہ قرون اولیٰ کے مجتہدین کے طریقہ پر خود بھی اجتہاد کیا اور براہ راست کتاب و سنت اور آثار صحابہؓ سے استنباط کر کے آنے والی نسلوں کے لیے راہ عمل متعین کی، نیز یہاں ان بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا، جو اس وقت سماج میں رچ بس گئی تھیں۔

وہ اشغال و اعمال جو صدیوں سے مذہبی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے، اور جن کے جواز بلکہ استحباب کی دلیلیں وضع کر لی گئی تھیں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے جب ان کو اسلام کے منافی پایا تو ان کی پرزور مخالفت کی،[1] انھوں نے تاتاری حملہ کے اثرات سے مسلم معاشرہ کو محفوظ رکھا اور مسلمانوں میں جہاد کا جوش و ولولہ پیدا کر دیا،[2]

مذکورہ بالا جائزہ سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ جب بھی مسلم سماج کو نئے چیلنج اور مختلف شکلوں میں رونما ہونے والے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تو ان کا مقابلہ اسی دور میں پوری طرح کیا گیا، یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کا اپنی اصلی صورت میں اسی طرح ہونا جس طرح کہ وہ پہلے دن تھی، مسلم مفکروں کے لیے بہت بڑا سہارا رہی۔

مذہب اسلام کے ماننے والے کتاب اللہ کو منزل من اللہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کا محفوظ ہونا بھی من جانب اللہ ہے، إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ[3] ان کا یہ بھی پختہ عقیدہ ہے کہ اگر یہ کتاب اللہ کے بجائے اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں بے شمار اختلافات ہوتے وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔[4] دوسری طرف

۱؎ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر طبع دوم ص ۸۸ ۲؎ ایضاً۔ ۳؎ سورہ حجر آیت ۹ ۴؎ سورۂ نساء آیت ۸۲

احادیثِ رسولؐ کو پرکھنے اور تولنے کے سخت اصول مرتب ہوئے جس کا انتہائی معیار یہ قرار پایا کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی[1]، مزید برآں روایت پر درایت کی ترجیح کے اصول نے روایات میں ہر طرح کے حذف و اضافہ کی گنجائش ختم کر دی۔

غرض ان ہی اہم اصولوں پر اہل اسلام آج تک کاربند ہیں، اور جس کو کتاب اللہ و سنت رسولؐ کے فہم میں جس قدر دسترس تھی، اس نے اسی کے اعتبار سے اپنے دور کے اہم سے اہم چیلنج کو سمجھ کر اس کا مقابلہ کیا،

مذہب کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت و نوعیت کے ضمن میں مشہور پروفیسر ولفریڈ کینٹول اسمتھ نے دو اہم باتوں کی طرف نشاندہی کی ہے، یہاں اس کا ذکر ضروری ہے، ایک یہ کہ "مذہب کے تقابلی مطالعہ کا طالب علم اس اصول موضوعہ کو مان کر چلتا ہے کہ اپنے مذہب کے سوا دوسروں کے مذہب کو سمجھنا ممکن ہے[2]" اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ "کسی مذہب کے بارے میں کوئی بیان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک خود اس مذہب کے ماننے والے بھی اس بیان کی صحت کو تسلیم نہ کریں[3]" جو لوگ ان اہم مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں یا مختلف مذاہب کے ماخذ کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ دونوں باتیں خاص طور پر اہم ہیں۔
کسی بھی مذہب کے دو اہم ماخذ و بنیادیں ہیں، ایک اس کا منزل من اللہ ہونا اور دوسرے جس ہستی کے ذریعہ وہ پیغام آیا ہے اس ہستی کا تاریخی اعتبار سے ثابت ہونا اور اس کے تمام اقوال و افعال کا محفوظ ہونا، اس کے بغیر وہ کسی نظریہ یا چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اگر یہ دونوں چیزیں کسی مذہب کے ماننے والے کے پاس ہوں تو قیاس و اجماع کی گنجائش بھی رہتی ہے اور مذہب کی روشنی میں نئے نئے مسائل کا حل تلاش کرنا بھی ممکن ہوتا ہے، ورنہ اس کے لیے نہ

---

[1] سورۂ نجم آیت ۲ [2] اسلام دور حاضر میں ص ۱۰۶، ترتیب شبیر الحق مکتبہ جامعہ سنہ ۱۹۷۴ء [3] ایضاً ص ۸۳۔

منزل مقصود تک پہونچنا ممکن ہوگا، اور نہ جدید افکار کا مقابلہ کرنے کی اس میں صلاحیت ہوگی، بلکہ وہ اپنی بقا کے لیے جدید افکار و نظریات سے مفاہمت و مصالحت کا طریقہ اپنائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جدید افکار و نظریات نے سر اٹھایا تو اس کا حل مذہب میں تلاش کرنے کے بجائے اس سے الگ ہٹ کر اس کا حل تلاش کیا گیا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب پر روایت پرستی کی بالادستی رہی۔

یہ اصول بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ مناظرانہ انداز فکر مذاہب کے تقابلی مطالعہ کیلئے سودمند نہیں ہے، کسی بھی مذہب کے مطالعہ کے لیے اس زبان سے ماہرانہ واقفیت ضروری ہوتی ہے جس میں اس مذہب کا فکری سرمایہ ہوتا ہے، مثلاً اسلام کو ہم عربی سے واقف نہ ہونے کی صورت میں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح ویدک دھرم کو سنسکرت کے بغیر، بدھ مت کو پالی کے بغیر، یہودیت کو عبرانی جانے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا، ہر مذہب کی کچھ بنیادی کتابیں ہوتی ہیں جن سے اس کے اصول معلوم ہوتے ہیں، بعد میں علماء کی بحثیں، تاویلیں اور اختلافات اسے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔

دراصل روایات اور خوش اعتقادیوں کے لامتناہی سلسلہ سے تنگ آکر اور تقلید جامد سے گھبرا کر ہی نہرو اور برٹرینڈ رسل نے ہندوازم اور مسیحیت کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا ہوگا، جس کے نتیجہ میں ان دونوں مفکروں نے بیک زبان ہو کر کہا ہوگا کہ ہندوازم کی کوئی تاریخ نہیں، اور مسیح کا وجود تھا بھی کہ نہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ، واقعات اور حقائق کے مقابلہ میں سینہ بسینہ روایات کا کیا درجہ ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی

اور

مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

از:- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے علمی و دینی کارنامے اظہر من الشمس ہیں، خصوصاً ردِّ عیسائیت میں وہ بہت ممتاز تھے، گو ان کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن اس سال رمضان المبارک میں ان کی وفات کو سو برس ہو گئے، اسی مناسبت سے مولانا محمد سلیم کیرانوی کے لائق فرزند اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ناظم مولانا محمد شمیم صاحب کی خواہش پر مولانا برہان الدین صاحب نے یہ مفید اور سبق آموز مقالہ سپردِ قلم کیا ہے، جس کو ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے شایع کیا جاتا ہے، ے

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی ذات گرامی اس لائق ہے کہ دوسرے رسالوں میں بھی ان پر مضامین شایع ہوں۔

"معارف"

مہبط وحی اور مرکز ایمان سے دور ہونے، اور نامعلوم مدت سے کفر و شرک کی ظلمتوں و تاریکیوں میں ڈوبی رہنے کے باوجود جب ہندوستان کی سرزمین ایمان و عرفان اور علم و احسان کے نور سے جگمگائی تو اس کی ضیاپاشی سے عجم ہی نہیں عرب بھی روشنی حاصل کرنے اور اس کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا، علم و عمل کے جو نیر تاباں افق ہند سے طلوع ہو کر سارے عالم کو منور کرنے میں مشغول رہے، ان کا سلسلہ سات سو سال پہلے سے چلا آرہا ہے اور ان کا شمار مشکل ہے،

ان میں بعض اصحاب جب دنیائے اسلام کے علمی مراکز میں پہنچے تو ان کے سامنے دوسروں کی شہرت ماند پڑ گئی اور اس کے بعد "چراغوں میں روشنی نہ رہی" کا سماں نظر آنے لگا، اس مضمون میں ایسی ہی ایک برگزیدہ اور نمایاں ترین شخصیت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ذکر مقصود ہے،

خاندان و وطن

حضرت مولانا رحمت اللہ اسم بامسمّٰی تھے، جو واقعۃً خداوند تعالیٰ کی رحمت ثابت ہوئے، وہ ایک ایسے علمی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، جس کی رگوں میں کبیر الاولیاء حضرت جلال الدین مخدوم پانی پتی قدس سرہٗ (م ۷۶۵ھ) جیسے عارف باللہ اور شیخ کامل، نیز شیخ عبد الرحمن گازرونی جیسے محقق عالم کا خون رواں تھا، اور وہ ان بزرگوں کے امتیازات و خصوصیات کا بھی پوری طرح حامل تھا، اسی خاندان کے مورث اعلیٰ شیخ عبد الرحمن، سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) کے ساتھ اس کے لشکر میں شرعی حاکم "قاضی عسکر" کی حیثیت سے گازرون سے ہندوستان کے مشہور مردم خیز قصبہ پانی پت میں تشریف لائے، اور پھر یہیں کے ہو رہے، ان کے ایک خاندانی اور ہمنام بزرگ مدینہ طیبہ سے گازرون آئے تھے جن کا سلسلۂ نسب دس واسطوں سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی ذی النورین رضؓ تک پہنچتا ہے، پانی پت میں اس خاندان کے افراد شروع ہی سے ممتاز اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، اکبری اور جہانگیری دور میں اس خاندان کے ایک نمایاں شخص نواب مقرب خان تھے، ان کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں اکبر بادشاہ نے کیرانہ اور اس کے مضافات بطور جاگیر انھیں عطا کیے تھے، اس طرح ان کے خاندان کا ایک حصہ پانی پت سے کیرانہ (ضلع مظفر نگر) منتقل ہو گیا اور یہیں اس نے مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی، چنانچہ مولانا رحمت اللہ کی ولادت کیرانہ ہی میں ہوئی،

ولادت اور تعلیم

حضرت مولانا رحمت اللہ علماء و صوفیہ کے اسی ممتاز گھرانے میں جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ

میں پیدا ہوئے، یہ بہت پر آشوب دور تھا، جب کہ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بس بجھا چاہتا تھا، اور ہندوستان، بالخصوص اس کے شمالی حصہ میں طالع آزماؤں کی یورش سے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا، امن و امان مفقود تھا، اور ہر طرف طوائف الملوکی بپا تھی، مولانا کی ولادت سے پہلے ان کی والدۂ محترمہ نے خواب دیکھا تھا کہ ان کی گود ایک ایسے چاند سے بھر گئی جس کی روشنی تمام عالم میں پھیلے گی، چنانچہ آغاز طفولیت سے ہی مولانا کی صلاحیتیں ظاہر و نمایاں تھیں، بقول شیخ سعدی علیہ الرحمہ،

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

بارہ[۱۲] برس کی عمر میں وہ قرآن مجید، فارسی کی درسی کتب اور دینیات کی تعلیم اپنے خاندانی بزرگوں سے حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے دہلی تشریف لے گئے، اور مولانا حیات[؟] کے مدرسہ میں داخل ہو کر درسیات کی تکمیل کی، علم کی پیاس مولانا کو، حضرت مولانا مفتی سعد اللہ رحمہ اللہ مراد آبادی (شاگرد رشید شاہ عبد العزیز دہلوی قدس سرہ) کے پاس لکھنؤ لے گئی، زمانہ کے رواج اور اپنی خاندانی روایات کے تحت اپنے عصر کے باکمال طبیب حکیم فیض محمد صاحب سے فن طب کی تحصیل بھی کی، ان کے ذوق علم اور علم و فن کی متنوع شاخوں سے بہرہ ور ہونے کے جذبہ کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ریاضی (حساب) کا درس مشہور مصنف ملو کارتھم سے لینے میں بھی دریغ نہیں کیا،

پادری فنڈر سے مناظرہ مولانا رحمت اللہ کے کارنامے گوناگوں ہیں، ان سب کو اس مختصر مضمون میں پیش کرنا ممکن نہیں، یہاں ان کے ایک یادگار اور عظیم الشان مناظرہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری اسلامی دنیا پر مولانا کا عظیم احسان ہے، یہ مناظرہ عیسائی مشنریوں اور پادری فنڈر سے ڈاکٹر وزیر خان کی رفاقت و معیت میں

ایسے زمانہ میں ہوا تھا جب انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی طور پر ہی نہیں، مذہبی طور پر بھی اپنا محکوم اور عیسائی بنا لینے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا، اور وہ اپنے گوناگوں وسائل و ذرائع کی وجہ سے ہر قسم کے طریقے استعمال کر رہے تھے، دراصل .. مسلمانوں کے لیے مقابلہ کے تمام امکانات ختم کرنے کی غرض سے انھیں دار و رسن تک کی سزائیں دینے میں بھی دریغ نہیں کر رہے تھے، ایسے نازک وقت میں مولانا رحمت اللہ کا مناظرہ کرنا ہی ایک بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا، چہ جائیکہ انھوں نے اس مناظرہ میں کامیابی حاصل کر کے ہندوستان میں عیسائیت کے جمتے ہوئے قدم اکھاڑ دیئے اور برطانوی استعمار کے ابتدائی دور میں ہی مسیحیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ موڑ دیا، ان کا خاص حریف پادری فنڈر مناظرہ میں شکست کھا کر ایسا مرعوب بلکہ ان کی شخصیت سے مسحور ہوا کہ مقابلہ کی اس میں تاب نہ رہی اور اسی خطرہ سے بچنے کے لیے اسے ہندوستان چھوڑنا پڑا، لیکن افتاد طبع سے مجبور ہو کر اس نے ایک دوسرے رو بہ تنزل مسلم ملک ترکی کے شہر قسطنطنیہ کو اپنی تگ و دو کا محور بنایا، مگر جب مشیت ایزدی نے مولانا رحمت اللہ کو وہاں بھی پہنچا دیا، تو اس سرزمین سے بھی اسے ہمیشہ کے لیے فرار ہو جانا پڑا،

عیسائیوں سے مناظرہ میں مولانا کے امتیاز کا اعتراف نہ صرف پورے عالم اسلام کے عوام و علماء ہی کو ہے، بلکہ اس وقت کے خلیفۃ المسلمین کو بھی اس میں مولانا کا لوہا ماننا پڑا، چنانچہ اس نے انھیں شاہی مہمان بنا کر خلعت فاخرہ سے نوازا، اس موضوع پر مولانا کے امتیاز کی زندہ جاوید شہادت ان کی معرکۃ الآرا کتاب "اظہار الحق" ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "لندن ٹائمز" نے لکھا تھا کہ "اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں عیسوی مذہب کی ترقی بند ہو جائے گی" کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے، کہ اس کے ترجمے بہت سی یورپین اور ایشیائی زبانوں انگریزی، فرانسیسی، ترکی، گجراتی، اردو وغیرہ

میں، ہو چکے ہیں، حال ہی میں پاکستان سے اس کتاب کا اردو ترجمہ "قرآن سے بائبل تک"
کے عنوان سے نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا ، اس کا مقدمہ "بڑے" خاصے کی
چیز ہے، جو مولانا محمد تقی عثمانی کے قلم سے ہے،

عہد وماحول مولانا کے امتیازات وکمالات کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب
ان کے عہد کے حالات بھی سامنے ہوں، اس لیے ہم اس پر آشوب اور نازک دور کا حال
مولانا حالی مرحوم کی زبانی ناظرین کو سنانا چاہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں،

"ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا، ایک طرف مشنری گھات میں
لگے ہوئے تھے، اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھر مل جاتا تھا،
اس پر قانع نہ تھے، اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے، ہندوستان میں سب سے
زیادہ دانت ان کا مسلمانوں پر تھا، اس لیے ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں
میں ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی، اسلام کی تعلیم کی طرح طرح
سے برائیاں ظاہر کرتے تھے، بانی اسلامؐ کے اخلاق وعادات پر انواع واقسام کی
نکتہ چینیاں کرتے تھے، بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر
افلاس کے سبب ان کے دام میں آگئے، اس خطرہ سے بلاشبہ علمائے اسلام جیسے مولانا
رحمت اللہ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر وزیر خان متنبہ ہوئے، انھوں نے متعدد کتابیں
عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرہ کیے، جن سے یقیناً مسلمانوں
کو بہت فائدہ پہنچا، اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی،
راہنما کی ضرورت تھی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے بہتر کون ثابت ہو سکتا تھا،
انھوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لیے دہلی، آگرہ کو مرکز قرار دیا،

اس تحریر سے عیسائیت کے مسموم اثرات اور اس کے فروغ کے لیے غیر معمولی جدوجہد
کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، مزید تفصیل کے لیے دوسرے نامور مؤرخ ومحقق علامہ سید سلیمان ندوی
علیہ الرحمہ کے یہ اقتباسات بھی ملاحظہ ہوں،

"انگریزوں کے برسرعروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، عیسائی مشنریوں
نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ ..... پر حملے شروع کر دیئے
دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر
ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون وتمدن کی ظاہری
چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی، خدا نے عیسائیت کے مقابلہ کے لیے
مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا
محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا سید محمد علی مونگیری وغیرہ اشخاص پیدا کیے،
جنھوں نے عیسائیت کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے، اور خصوصیت کے
ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود عیسائیت
کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں، آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لیے خاص
طور پر مولانا محمد قاسم صاحب کا ظہور بھی تائید غیبی ہی کا نشان ہے، اور پھر جس طرح
عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا
رشید احمد گنگوہیؒ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا، اس کے آثار
باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں"

حال ہی میں سعودی عرب کی مشہور یونیورسٹی جامعۃ الامام محمد (ریاض) سے ایک اردو دانی
عرب فاضل شیخ محمد عبدالقادر ملکاوی، نے مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر پر تحقیقی مقالہ لکھ کر

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے،

عیسائیت کا کامیاب مقابلہ

غرضیکہ علمائے حق اور دین کا درد وحمیت رکھنے والے افراد جن کے سرخیل مولانا رحمت اللہ صاحب تھے، ان کے ان مخلصانہ اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف عیسائیت کا فروغ بند ہوگیا، بلکہ اس کے مبلغین (مشنریز) دفاعی پوزیشن میں آکر بالآخر ہار ماننے پر مجبور ہوئے، اس موضوع کی جانب علماء نے بڑا اعتنا کیا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس پر چھوٹی بڑی کم وبیش سو کتابیں لکھی گئیں، مولانا امداد صابری صاحب دہلوی نے اپنی کتاب "آثار رحمت" میں جو مولانا رحمت اللہ کے حالات میں ہے، بہتر[2] کتابوں کی فہرست دی ہے، ان میں زیادہ اہم اور کامیاب کتابیں مولانا کی "اظہار الحق" جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور "ازالۃ الاوہام" ہیں ان کے علاوہ بھی انھوں نے اس موضوع پر آٹھ کتابیں لکھیں، جن کا غیر معمولی مفید اثر پڑا،

مولانا کی حمیت اور دور اندیشی

اس صورت حال کی بنا پر انگریزوں سے مولانا کی نفرت اور ناگواری ایک طبعی امر تھا، چنانچہ وہ "مشن اسکولوں" میں عام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے پڑھنے کو نہایت ناپسندیدہ اور انتہائی خطرناک خیال کرتے تھے، کیونکہ مشہور انگریز ماہر تعلیم کے قول کے مطابق "ان تعلیم گاہوں کا مقصد رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی، مگر ذہن و فکر کے لحاظ سے انگریز تیار کرنا تھا" مولانا کا یہ خیال بعد کے واقعات وتجربات سے حرف بحرف صحیح ثابت ہوا، علاوہ ازیں اسے وہ غیرت ملی کے بھی خلاف سمجھتے تھے، ایک دفعہ ان کے قریبی عزیز کا ایک بچہ "مشن اسکول" میں داخل کیا گیا تو وہ بے چین ہوگئے، اور جب تک یہ بچہ اس اسکول سے علیحدہ نہیں ہوا اس وقت تک وہ اس کے لیے برابر فکر مند رہے، بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، یہی بچہ آگے چل کر مولانا محمد سعید کے نام سے معروف اور مدرسہ صولتیہ

کی تعمیر وترقی میں مولانا کا دست راست اور معاون بنا،

مولانا کے مجاہدانہ کارنامے

مولانا ذوالریاستین یعنی صاحب سیف وقلم تھے، ۱۸۵۷ء کی اولین جنگ آزادی میں شاملی کے مشہور معرکہ میں انھوں نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے، اس زمانہ میں کیرانہ کی جامع مسجد مجاہدین کی چھاؤنی میں تبدیل ہوگئی تھی، جہاں مجاہدین کی باقاعدہ تنظیم وتربیت کی جاتی تھی، اس سلسلہ میں مولانا کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے نقارہ کی آواز پر یہ اعلان ہوتا تھا: "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا" غالباً یہ جواب تھا ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس طنزیہ جملہ کا کہ "ملک بادشاہ کا حکم کمپنی کا"۔

انگریزوں نے غالب آنے کے بعد تمام مجاہدین کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا، انھوں نے جن لوگوں کو گرفتار کیا، ان میں سے اکثر کو سزائے موت دی، لیکن کچھ لوگ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے اور ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کرجانے میں کامیاب ہوگئے، انہی لوگوں میں مولانا بھی تھے، جو ناقابل بیان تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے، مہیب جنگلوں اور خطرناک راستوں کو پیادہ پا طے کرتے ہوئے سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے جدہ روانہ ہوئے اس جرم بے گناہی کی پاداش میں ان کی تمام خاندانی جائداد ضبط کرلی گئی اور کوڑیوں کے مول نیلام ہوکر برطانوی حکومت کے وفاداروں کو دے دی گئی،

رحمت اللہ بیت اللہ میں

مولانا کے بیت اللہ پہنچنے اور وہاں کی سرگرمیوں کی مختصر روداد مولانا کے چشم وچراغ مولانا محمد سلیم صاحب کے الفاظ میں کسی قدر تغیر کے ساتھ یہاں پیش کی جارہی ہے،

"طویل سفر کے آلام ومصائب برداشت کرتا ہوا یہ سربکف مجاہد اسلام مرکز اسلام

پہنچا، تاکہ کعبہ کے زیر سایہ خدمتِ اسلام کا کوئی پہلو نکال سکے، ہندوستان میں اس علمی جماعت (مجاہدین) کے اکثر افراد نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ سے کچھ پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے، ..... مطاف میں حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں سید احمد دحلان شیخ العلماء (سب سے بڑے عالم) تھے، اور مسجد حرام میں ان کا حلقۂ درس مرجع عام تھا، ..... حضرت مولانا رحمت اللہ نے حالات کا جائزہ لیا اور علمائے حرم سے تعلقات پیدا کیے، جب ایک خاص علمی مذاکرہ شیخ العلماء سید احمد زینی دحلان سے مولانا کے تعلق و تعارف کا سبب بنا تو انھوں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت کی، مولانا نے اختصار کے ساتھ کچھ حالات بیان کیے، دوسرے دن شیخ دحلان نے انھیں اپنے گھر بلایا اور وہاں مولانا نے انقلاب ۵۷ء کے تمام حالات اور خاص طور پر نصاریٰ کی مذہبی کوششوں اور رد نصاریٰ میں مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابی کی تفصیل بیان کی، جس پر شیخ دحلان نے بید مسرت کا اظہار کیا، اور حضرت مولانا رحمت اللہ کو مسجد حرام میں باقاعدہ درس دینے کی اجازت دی"

سلطان ترکی کی دعوت پر مولانا کا سفر ترکی،

جیسا کہ شروع میں ذکر آچکا ہے کہ پادری فنڈر ہندوستانی علماء، بالخصوص مولانا رحمت اللہ سے مناظروں میں شکست کھانے کے بعد ہندوستان سے فرار ہو کر ترکی کو اپنے ترک و تاز کا مرکز بنانا چاہا اور وہاں جا کر یہ ڈینگ ماری کہ میں ہندوستانی علماء کو شکست دے کر آیا ہوں، اس پر اس وقت کے سلطان ترکی عبد العزیز نے شریف[1] مکہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ہندوستانی حجاج سے اس مناظرہ کی حقیقت

[1] ترکی دور حکومت میں حجاز کے انتظامی عرب عہدہ دار کا منصبی لقب "شریف" ہوتا تھا،

دریافت کر کے مطلع کیا جائے، شریف مکہ نے شیخ زینی دحلان کو متوجہ کیا کہ وہ اس بارے میں معلومات فراہم کر کے بھیجیں، شیخ دحلان چونکہ مولانا رحمت اللہ سے مناظرہ کی تفصیلات سن چکے تھے، اور وہ مولانا کی شخصیت سے متاثر تھے، اس لیے انھوں نے بلا پس و پیش فرمایا کہ، "جس عالم سے وہ مناظرہ ہوا تھا وہ خود یہاں موجود ہے" مولانا رحمت اللہ کے سفر ترکی کی یہی تقریب بنی، اور وہ سلطان کی دعوت پر نہایت اعزاز کے ساتھ شاہی مہمان کی حیثیت سے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں ترکی گئے، ان کی قسطنطنیہ میں آمد کی خبر سن کر پادری فنڈر روپوش ہو گیا، پھر سلطان کی ہی درخواست پر مولانا نے وہ معرکۃ الآراء کتاب "اظہار الحق" لکھی، جس نے عیسائی دنیا میں تہلکہ مچا دیا، اس کے بعد بھی دو ایک مرتبہ اور مولانا سلطان ترکی کی دعوت پر ترکی گئے اور انھیں سلطان نے حرمین شریفین کے خادم خاص (پایۂ حرمین شریفین) کے اعزاز اور ایک مرصع تلوار سے نوازا،

مولانا کی خودداری

گو مولانا نے یہ کتاب سلطان ترکی کی خواہش پر لکھی تھی، مگر اس کے مقدمہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا، اس کی طرف جب سلطان کے ایک مقرب خاص نے توجہ دلائی تو مولانا نے فرمایا: "اس خالص مذہبی خدمت میں کسی دنیاوی غرض و مقصد کا کوئی شائبہ نہ آنا چاہیے"

حرم کی سرزمین میں تعلیمی سرگرمیاں

مولانا رحمت اللہ کے زمانہ میں اگرچہ سرزمین حرم علمائے کبار، اہل افتاء اور ماہرین فن سے خالی نہ تھی، اور جا بجا تدریسی حلقے اور تعلیمی سلسلے بھی قائم و جاری تھے، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ وہاں کی درسگاہوں میں نہ تو کوئی نصاب مقرر تھا، نہ کوئی خاص ترتیب تھی، اور نہ طلبہ کے قیام و طعام وغیرہ کی آسانیاں تھیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اول تو طالب علموں کے قیام کا مسئلہ ہی بڑا مشکل ہوتا تھا، اور اگر کوئی اس دشواری کو حل کرنے میں کامیاب بھی

ہو جاتا تو وہاں کے رائج طریقۂ درس کی وجہ سے مدتوں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود قابلیت، علمی صلاحیت اور اچھی استعداد پیدا نہ ہوتی تھی، خاص طور پر مہاجرین کی اولاد کی تعلیم و تربیت کا نظم تو اور بھی ناقص تھا، اس لیے مولانا رحمت اللہ نے اس جانب توجہ مبذول کی، جسکی تفصیل آگے آ رہی ہے،

مدرسہ صولتیہ کا قیام اور تعلیم کے ساتھ صنعت پر زور، تعلیم کی اس صورت حال کے پیش نظر مولانا نے جو اقدامات کیئے ان کے بارے میں حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ (سابق ناظم مدرسہ صولتیہ) لکھتے ہیں:۔

"ان تمام حالات اور گرد و پیش کی ضرورتوں پر کافی غور کرنے کے بعد یہ پہلا شخص تھا، جس نے اہل حرم اور شائقین علوم دینیہ کی ضرورت کا احساس کیا، اور اپنے حکیمانہ دماغ سے یہ بات پیدا کی، کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی مٹی ہوئی درسگاہ کا زمین حرم پر احیا کیا جائے، مہاجرین کی اولاد اور اہل عرب کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظام کے ساتھ انھیں صنعت و دستکاری سکھانے کے لیئے ایک باقاعدہ صنعتی اسکول بھی اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جائے تاکہ اہل حجاز اور مہاجرین کی اولاد ضروری اور ابتدائی تعلیم کے بعد گداگری اور افلاس کا شکار ہو کر ننگِ اسلام نہ بنیں"

چنانچہ ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کی غرض سے مولانا ایک مدرسہ ۱۲۹۰ھ میں قائم کیا، جو شروع میں کچھ عرصہ تک ایک ہندوستانی رئیس (مقیم مکہ معظمہ) کے مکان کے ایک حصہ میں رہا، پھر کلکتہ کی ایک مخیر خاتون صولت النساء بیگم نے مدرسہ کے لیے مستقل زمین اور عمارت کا بندوبست کر دیا تو (۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء میں) اس میں منتقل ہو گیا، اس محسن و سخی خاتون کے نام پر ہی مدرسہ کا نام "صولتیہ" رکھا گیا، مدرسہ کے مستقل معاونین میں اکثر ہندوستانی مہاجر تھے، رفتہ رفتہ یہ مدرسہ

حجاز کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ بن گیا، جس میں طلبہ کے لیے اقامت گاہیں (بورڈنگ ہاؤس) درسگاہیں، کتب خانہ، غرضیکہ ہر کام کے لیے علٰحدہ علٰحدہ بڑی بڑی پرشکوہ عمارتیں ہیں، جو اس وقت حجاز کے کسی اور مدرسہ میں نہیں تھیں،

یادگار مسجد مدرسہ کے لیے ایک مستقل عظیم الشان مسجد بھی مولانا رحمت اللہ نے صحن حرم شریف کے ایک کتب خانہ کے ملبہ سے تیار کرائی، ماضی قریب تک حجاز کا یہ سب سے بڑا مدرسہ تھا، جس کے فضلا جج، ایڈمنسٹریٹر، استاذ، مفتی اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے، خود شریف مکہ (حاکم مکہ) شریف حسین بن علی نے بھی اس میں تعلیم حاصل کی تھی،

مدرسہ صولتیہ کا فیض عام مدرسہ صولتیہ کو قائم ہوئے ایک صدی سے زائد عرصہ گذر اس وقت سے اب تک برابر اس کا فیض جاری ہے، درمیان میں گو نہایت صبر آزما اور دشوار حالات سے اسے دوچار ہونا پڑا، مگر خداوند تعالیٰ کی مدد اور اس کے منتظمین کی حسن تدبیر، بیدار مغزی اور معاملہ فہمی کی بدولت وہ ان سب مراحل کو جھیل لے گیا، کیونکہ اللہ کے خاص فضل و کرم سے اسے ہمیشہ اور ہر دور میں نہایت مخلص اور بیدار مغز کارکن میسر آتے رہے، اس کے بانی اور ابتدائی دور کے منتظم مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہٗ تھے، اس کے بعد انھی کے برادر زادہ مولانا محمد سعید رحمہ اللہ، پھر مولانا محمد سلیم علیہ الرحمہ ناظم و مہتمم ہوئے، حضرت مولانا محمد سلیم رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے اور جاننے والے ہزاروں اشخاص اب بھی موجود ہیں، جو ان کی پر عظمت شخصیت اعلیٰ انتظامی صلاحیت، علم دوستی اور اخلاقی خوبیوں کے معترف اور گرویدہ ہیں، چنانچہ مولانا محمد سلیم کے متعلق مدرسہ صولتیہ کے ایک عظیم فرزند اور ہندوستان کے ممتاز عالم مولانا قاری حمید الدین سنبھلی جو راقم کے والد ماجد تھے، اپنے سفر نامۂ حج (۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء) میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آں محترم (مولانا محمد سلیمؒ) کی مجلس سے بیش بہا فائدے پہنچے،.... معزز ترین علما اور

شرفا اور اعلیٰ خاندان کے افراد کا اکثر وہاں اجتماع رہتا، ہندوستان سے جانے والے ممتاز افراد کا بھی وہی ملجا تھے، ... مولانا موصوف خلوص اور حسن اخلاق کا مجسمہ تھے، ان کی مجلس ایسی باغ و بہار ہوتی تھی کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا اور نہ کبھی سیری ہوتی، ہر علم وفن نیز فن تدریس اور طریقۂ تعلیم و تربیت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نظم وانتظام کی اعلیٰ قابلیت کا ادنیٰ مظہر مدرسہ صولتیہ جیسے عظیم ادارہ کا اس پرآشوب اور نازک ترین دور میں حسن و خوبی سے چلانا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ کے در و بام اگر "دار التدریس" تھے تو آپ کی مجلس "دار التہذیب"۔

مدرسہ صولتیہ کا خاص کارنامہ مدرسہ صولتیہ میں بھی انہی علوم وفنون کی تعلیم و تدریس کا نظم تھا جو اس زمانہ کے دینی مدارس میں مروج تھے، یعنی بنیادی طور پر درس نظامی جزوی ترمیم واصلاح کے ساتھ اس میں بھی رائج تھا، لیکن اس کا خاص امتیاز فن تجوید وقرأت کے ماہرین پیدا کرنا ہے، اس مدرسہ کے قیام سے پہلے حجاز میں ہندوستانی علماء و حفاظ قرآن مجید غلط پڑھنے کے لیے اتنے بدنام تھے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں تامل کیا جاتا تھا، اسی احساس کی بناء پر مدرسہ کے ذمہ داروں نے سب سے زیادہ اسی طرف توجہ دی، پھر تو خدا کے فضل وکرم، منتظمین کے اخلاص اور اساتذہ کی محنت و مہارت کے نتیجہ میں مدرسہ صولتیہ کے خوشہ چین عجم ہی میں نہیں عرب میں بھی فن تجوید و قرأت کے اندر مشہور اور نیک نام ہوئے اور ہندوستان میں اس مدرسہ کے فضلاء نے فن قرأت و تجوید کو عام کرنے اور مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا، یہاں چند قراء کے نام نقل کیے جاتے ہیں، قاری عبد اللطیف صاحب، قاری عبد اللہ صاحب مکی، اور ان کے برادر خورد قاری عبد الرحمن صاحب مکی، حضرت مولانا قاری اشرف علی تھانوی، قاری عبد الوحید صاحب، قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادی، قاری عبد الخالق صاحب

سہارنپوری اور ان کے برادر خورد قاری عبد المالک صاحب لکھنوی، مولانا قاری ضیاء الدین صاحب مدراسی، مولانا قاری حمید الدین صاحب سنبھلی، مولانا قاری سید مرتضیٰ حسین بہوی رحمہم اللہ وغیرہ کی بدولت یہ فن عام ہوا۔

مدرسہ صولتیہ کا رفاہی کام مولانا محمد سلیم صاحبؒ کے زمانہ سے مدرسہ صولتیہ نے عام حجاج بالخصوص برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے حجاج کی مختلف النوع خدمات کا بڑا ہی مفید سلسلہ قائم کیا ہے، ایک طرف مدرسہ کے علمی فیض میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف ضیوف الرحمٰن (حجاج) کو اس سے بڑی راحت ملتی ہے، اور ان کے دل کی گہرائیوں سے مدرسہ اور اس کے کارکنوں کے لیے دعائیں نکلتی ہیں، یہ مدرسہ دیہات کے اور بے پڑھے لکھے یا کم پڑھے لکھے حجاج کے لیے واقعی خدا کی خاص "رحمت" ہے، مدرسہ کے موجودہ ناظم اور مولانا محمد سلیم صاحبؒ کے خلف ارشد مولانا محمد شمیم صاحب اس کی گذشتہ روایات کو نہ صرف باقی رکھے ہوئے ہیں، بلکہ ان میں برابر اضافہ فرما رہے ہیں، فجزاہم اللہ احسن الجزاء، یہ سب بالواسطہ فیض ہے، اسی چشمۂ رحمت کا جس کا نام رحمت اللہ تھا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کاملۃ۔

اس مضمون میں حسب ذیل مآخذ سے استفادہ کیا گیا:۔

(۱) "ایک مجاہد معمار" از مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی (حفید حضرت مولانا رحمت اللہ و سابق ناظم مدرسہ صولتیہ)، (۲) "اقوال الصالحین" از مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی (اس میں حضرت مولانا رحمت اللہ علیہ الرحمۃ کے بارے میں ممتاز علماء کی آراء ہیں)، (۳) "آثار رحمت" از مولانا امداد صابری دہلوی، (۴) "فیضان رحمت" از مولانا امداد صابری دہلوی، (۵) "زبان حال" روداد ہائے سالانہ مدرسہ صولتیہ) مرتبہ:۔ مولانا محمد شمیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ، (۶) "سفر نامۂ حج" (قلمی) از مولانا قاری حمید الدین صاحب سنبھلی، (۷) راقم سطور (محمد برہان الدین) کا ایک مقالہ شائع شدہ رسالہ "قاری" دہلی (پہلا شمارہ، پہلی جلد)،

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی وفات

پر

تعزیتی خطوط

"جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کی وفات کے بعد اندرون ملک سے موصول ہونے والے منتخب تعزیتی خطوط شائع کیے جا چکے ہیں، اس سلسلہ کا آغاز بیرون ملک کے خطوط سے ہوا تھا، اور اختتام بھی اسی پر کیا جاتا ہے، مرحوم پر معارف کے خاص نمبر شائع کرنے کا پہلے ہی اعلان کیا گیا تھا، جس کے لیے متعدد اہل قلم کو الگ سے خطوط لکھ کر مضامین کی فرمائش بھی کی گئی ہے، اس تحریر کے ذریعہ ان حضرات سے جلد مضامین ارسال کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔"

اسلامک سینٹرل کلچر، پیرس یکم مارچ ۱۹۸۸ء

مخدوم و محترم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

۲۴ر فروری کا نوازش نامہ آج ملا، سرفراز بھی ہوا، شرمندہ بھی، مجھے صباح الدین صاحب کی شہادت کی جیسے ہی اطلاع ملی تھی، میں نے ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب کو ڈربن تعزیتی خط لکھا تھا کہ کسی اور قریبی رشتہ دار سے واقف نہ تھا،

میں نے معارف کو یا دارالمصنفین کو اس لیے نہیں لکھا کہ اس کی طباعت و اشاعت کا ڈر تھا، مجھے یہ چیز پسند نہیں، میری خیال آرائی کی اہمیت بھی کیا ہے؟ اگر مرحوم کی سوانحعمری لکھوں تو الگ بات ہے، اور یہ ناممکن ہے، کیونکہ اس کا کوئی مواد میرے پاس نہیں، خیال

فرمائیے کہ مرحوم سے ساری عمر میں صرف دو بار ملاقات ہوئی ہے، ایک اعظم گڈھ میں جنگ کے دوران میں، اور دوسری حال میں کوئی چالیس سال کے وقفے سے، کبھی نجی خط و کتابت بھی نہیں رہی، بجز معارف کے،

میں معارف کو دنیا کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ سمجھتا ہوں، اس میں کچھ چھپنا میرے مضمون کی عزت افزائی ہے، زندگی ہے تو سابق کی طرح آئندہ بھی ضرور لکھوں گا، (انشاء اللہ) مگر قریبی فرصت میں نہیں کہ آج کل دیگر کاموں میں غرق ہوں (واقعی غرق ہوں) کبھی کبھی ڈاک پر ڈاکہ پڑتا ہے، ورنہ معارف برابر آتا ہے، اور اس سے استفادہ کرتا رہتا ہوں،

حفظکم اللہ و عافاکم، حمید اللہ،

اقبال اکادمی پاکستان، ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۷ء

محترم جناب ناظم صاحب مجلس دارالمصنفین معارف اعظم گڈھ،

السلام علیکم،

محترم و مکرم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی وفات ایک حادثۂ جانکاہ ہے، جس پر اقبال اکادمی پاکستان کے تمام کارکن دلی دکھ کا اظہار کرتے ہیں،

مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایک ممتاز محقق، عالم دین اور معارف کے فاضل مدیر تھے، دارالمصنفین کی نظامت کے سلسلے میں اور اپنے علمی و تصنیفی کاموں کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، میں اور میرے رفقائے کار مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں، خدا ان کی خوبیوں کو قبول فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے آمین،

نیازمند: پروفیسر محمد منور، ناظم،

شکاگو (امریکہ)

مورخہ ۵ر جنوری ۱۹۸۸ء

مکرمی و محترمی جناب اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

شہر شکاگو میں غالباً میں رسالہ معارف کا واحد خریدار ہوں، ہر ماہ اس جریدہ کا بے چینی سے منتظر رہتا ہوں، جب ماہ نومبر کا شمارہ ملا، سرورق الٹتے ہی معارف کے مدیر شہیر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے سانحۂ ارتحال کی خبر میرے حواس پر برق خاطف بن کر گری، دیر تک میری بصارت اس خبر وحشت اثر کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی،

معارف کے علمی اور ادبی مضامین سے قطع نظر ہر ماہ شذرات کی صورت میں مرحوم کے رشحات قلم سے نہ صرف میں بلکہ تمام علم دوست ناظرین مستفید ہوتے رہے، ان کی انشا، میں بیک وقت زبان کی حلاوت، تشبیہہ و استعارہ کی لطافت، تفہیم مسائل کی مہارت، باحسن الوجوہ پائی جاتی تھی، ہر مضمون محققانہ اور ہر تحریر عالمانہ، ان کا صریر خامہ بلامبالغہ نوائے سروش تھا، شخصیات کے موضوع پر ان کا موئے قلم بڑی دلآویز گلکاری کیا کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ جملے کے جملے اور فقرے کے فقرے حفظ کر لیے جائیں، مختلف النوع اصناف کی مطبوعات پر بڑی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے تنقید و تبصرہ کیا جاتا، کسی کتاب کے محاسن پر جس دیانت داری سے داد تحسین دی جاتی، وہاں اس کے سُقم کو واشگاف کرنے میں ان کا قلم کبھی نہ چوکتا، ایسی جامع الصفات ہستی اور عالم کا آناً فاناً صفحۂ ہستی سے اٹھ جانا موت العالِم کے مترادف ہے،

دسمبر کے شمارہ میں آپ کے قلم سے ان کے مناقب کو پڑھ کر ایک نعمت عظمیٰ سے محرومی کا احساس ہوا، انھوں نے اپنے علمی، ادبی، مذہبی کارہائے نمایاں سے بلاشبہ، علامہ شبلیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی جانشینی کا حق ادا کر دیا، "معارف" ایک صاحب قلم مدیر، دار المصنفین ایک

پختہ کار اور محقق مصنف اور شبلی اکیڈمی ایک بے مثل رفیق کی خدمات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی، معلوم نہ ہوا کہ پس ماندگان میں کون کون ہیں اور ان کا علمی اور معاشی موقف کیا ہے؟

اس ملی متاع کے لٹ جانے سے قلب و جگر پر جو جراحت عائد ہوئی ہے اس کے اندمال میں نہ معلوم کتنا عرصہ لگے گا، دعا ہے کہ معارف کو ان کا نعم البدل عطا ہو۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه واسكنه وادخله فی الجنة

راقم محمد عبدالرحمٰن سعید صدیقی،

مجلس المعارف الاسلامیہ ممباسا، کینیا ۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

جناب ناظم صاحبؒ دار المصنفین اعظم گڈھ، حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی وفات کی خبر سن کر مجلس المعارف الاسلامیہ ممباسا کو گہرا رنج و غم ہوا، یہ اطلاع مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کے گرامی نامہ اور الرائد، تعمیر حیات اور تکبیر کراچی وغیرہ اخبار و رسائل سے ہوئی۔

مرحوم ان بڑے مورخوں اور مسلم دانشوروں میں تھے جن کے نام انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں، عہد اسلامی کے ہندوستان کی تاریخ پر ان کی تصنیفات خصوصیت سے اہم اور بیش قیمت ہیں، اور یہ مغل حکمرانوں کے دور کے بارے میں مفید معلومات و تحقیقات کا گنجینہ ہیں، اس کے علاوہ دور حاضر کے مسائل اور مسلمانوں کو در پیش امور کے بارہ میں بھی ان کی تحریری کاوشیں ہماری تحسین و آفرین کی مستحق ہیں، ان میں انھوں نے مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کا حق ادا کر دیا ہے،

وہ محقق کبیر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے پروردہ اور ان کے جانشین تھے، اس وقت انکی

---

[1] یہ عربی مکتوب کا ترجمہ ہے۔

وفات سے نہ صرف دارالمصنفین اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں بلکہ پورے عالم اسلام میں ایک زبردست خلا ہوگیا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ دارالمصنفین کو ان کا بدل مہیا کرے تاکہ اس راہ و مقصد کی تکمیل میں یہ کارواں اپنا سفر برابر جاری رکھے جس کی ابتدا علامہ شبلیؒ نے کی تھی اور جن کے نقش قدم پر مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی گامزن تھے، اور پھر ان کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن بھی اس راہ کو طے کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا رحم کرے، ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اجر جزیل عطا فرمائے، اور آپ لوگوں کو بھی اپنے حفظ و امان میں رکھے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا دینی بھائی سراج الرحمن ندوی قاسمی

رئیس مجلس المعارف الاسلامیہ بھابھا

دارالدعوۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۷ء

گرامی مرتبت ارکان و رفقائے دارالمصنفین اعظم گڈھ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

معارف کی حالیہ اشاعت (نومبر ۱۹۸۷ء) سے مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی حادثاتی موت کی تصدیق ہوگئی، جس پر ادارہ دارالدعوۃ السلفیہ (الاعتصام وغیرہ) کے اراکین دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سید صاحب مرحوم کو جنت الفردوس میں مقامات بلند عطا فرمائے۔

سید صاحب مرحوم بلاشبہ ایک بلند پایہ عالم دین، محقق، ادیب اور صحافی تھے، دارالمصنفین کی نظامت اور ماہنامہ معارف کی ادارت جس حسن و خوبی سے انجام دے رہے تھے وہ ان کی گوناگوں

صلاحیتوں کا مظہر تھا، تصنیف و تالیف میں بھی آپ کی خدمات یقیناً قابل قدر ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کی جو موجودہ کیفیت ہے اور اس ملت پر جو نوع بہ نوع ابتلاؤں کا دور ہے، اس میں سید صاحب جیسے مدبر عالم کا اٹھ جانا ایک نقصان عظیم ہے، ہماری دعا ہے، کہ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کو اپنے کام کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، مرحوم کی مغفرت اور ان کے لواحقین و احباب و رفقاء کو صبر جمیل عطا فرمائے، دارالدعوۃ السلفیہ اور الاعتصام کے رفقاء آپ سب حضرات کے غم میں برابر کے شریک ہیں، والسلام

(جنرل سکریٹری) حافظ احمد شاکر بن مولانا محمد عطاء اللہ حنیفؒ

اور رفقائے ادارہ

دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، لندن ۲ر رجب ۱۴۰۸ھ / ۲۱ر فروری ۱۹۸۸ء

کرمی و محترمی جناب مولوی ضیاء الدین صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے اچانک انتقال پر ملال کی خبر اس جانکاہ سانحہ کے فوراً بعد مل گئی تھی، انتظار تھا کہ یہ خبر معارف میں بھی پڑھ لوں تو خط لکھوں، نومبر ۸۷ء اور جنوری ۱۹۸۸ء کے پرچے اسی ہفتہ ملے، دسمبر کا پرچہ ابھی تک ڈاک میں ہی ہے، کچھ خیال یہ بھی تھا کہ اتنے بڑے سانحہ کے بعد آپ حضرات بیحد مصروف ہوں گے اور دارالمصنفین کے بزرگ علماء اور دیگر حضرات اور ان کے خطوط اور ٹیلی گرام بڑی تعداد میں آتے ہوں گے، اس صورت میں ہم جیسے پردیسی اور تقریباً غیر علمی لوگوں کے خطوط دیر ہی سے پہونچیں تو شاید بہتر ہو۔

میں ۱۹۴۳ء میں چند ماہ شبلی کالج میں طالب علم رہا ہوں، اس کے بعد ۱۹۴۶ء اور

۱۹۷۷ء میں جناب سید صباح الدین صاحب سے لکھنؤ میں ملاقاتیں رہیں، ۱۹۸۳ء میں اس ادارہ کی دعوت پر سید صباح الدین صاحب نے لندن کا سفر کیا، اور یہاں ہمارے عالمی سمینار میں شرکت فرمائی، سمینار کا موضوع تھا: اسلام میں حکومت اور سیاست' اس سمینار کے شرکا پر اسلامی انقلاب ایران کا گہرا اثر تھا، سید صباح الدین صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار انتہائی مدبرانہ اور عالمانہ انداز میں فرمایا، سمینار کے بعد وہ کئی ماہ لندن میں رہے، ہندوستان واپسی سے پہلے میرے گھر تشریف لائے، آپ نے لندن کا سفرنامہ تفصیل سے لکھا جو معارف کے کئی پرچوں میں شایع ہوا، سید صباح الدین صاحب نے بعض باتوں میں ہم سے اور خصوصاً میرے خیالات سے شدید اختلاف فرمایا، لیکن اس اختلاف کو بڑی ہمدردی اور محبت کے ساتھ تحریر میں ادا کیا، میرے گھر آپ پورے دن رہے، اور گفتگو مفصل رہی، ان کی شفقت اور محبت کا مجھ پر بڑا احسان ہے، خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے، آمین، تاریخ کے جس تاریک ترین دور سے ہم گذر رہے ہیں ایسی مرحوم جیسی ہستیاں مشعل راہ رہی ہیں، ایسے تاریک دور میں ایسی ہستیوں کا پیدا ہو جانا ہی اسلام کے ابدی پیغام کی دلیل ہے۔

اس ادارہ کی طرف سے اور میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیے، اور مرحوم کے متعلقین تک بھی ہماری تعزیت پہونچا دیجیے، اللہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے، والسلام۔ کلیم صدیقی

جوگی نگر لین ڈھاکا (بنگلہ دیش) ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء

مدیر محترم! السلام علیکم۔ یہاں معارف دیر سے پہونچتا ہے، دسمبر میں نومبر کا شمارہ موصول ہوا، سیاہ حاشیہ پر نظر پڑتے ہی دل میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہو گیا، پرنم

آنکھوں سے "حادثۂ جانکاہ" پڑھا، سکتہ طاری ہو گیا۔

صاحب طرز ادیب، ماہر فن اور مستند تاریخ داں سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم و مغفور کا جادو بیان اور معتبر قلم حق گوئی کی آبرو اور وقار تھا، موصوف شریف النفس اور نیک طینت انسان تھے، ان کی تحریر میں سحر آفرینی ہے، شگفتگی ہے، تازگی ہے، دلکشی ہے، رعنائی ہے اور تاثر آفرینی ہے۔

ان سے صرف ایک بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا، شاید ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء کی بات ہے، "دبستان فکر و نظر" ڈھاکا کی جانب سے "مولانا شبلی نعمانیؒ" پر ایک سمینار اسلامک اکیڈمی ڈھاکا کے اوڈیٹوریم میں ہوا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر حنیف فوقؔ شعبۂ اردو و فارسی دانشکدہ ڈھاکا (اس وقت فوقؔ صاحب شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہیں) کرنے والے تھے، میں سمینار سے ایک روز قبل حنیف فوقؔ صاحب کی آسایش گاہ پر یاد دہانی کی غرض سے گیا، انھوں نے کہا کہ بہت ہی موقع ہے ایک صاحب علم ہستی (سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم و مغفور) شبلی اکادمی اعظم گڈھ سے تشریف لائے ہیں، وہ ڈاکٹر شمیم کے یہاں قیام پذیر ہیں اور صدارت کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں ان سے رابطہ قائم کریں، تقی الدین ملک اور میں ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر گئے، سید صباح الدین صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور بے چون و چرا صدارت قبول کر لی، میں نے ایسی انکساری، عاجزی اور سادگی بہت ہی کم اردو ادیبوں اور شاعروں میں دیکھی ہے (البتہ بنگالی ادیبوں اور شاعروں میں ایسی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں) ان (اردو ادیبوں اور شاعروں) میں بیجا فخر و افتخار، غرور و تمکنت، رکھ رکھاؤ اور انا کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، ان (سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم و مغفور) کی شرکت سے سمینار میں حسن، وقار اور وزن پیدا ہو گیا تھا، میرے خیال میں پھر آج تک یہاں ایسا کامیاب سمینار مولانا شبلی نعمانیؒ پر نہیں ہوا، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ لوگوں اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، مرحوم و مغفور کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور آپ حضرات کو استقامت عطا کرے کہ دارالمصنفین کا علم بلند سے بلند تر کرتے جائیں، آمین۔

شریک غم: شعیب عظیم

بابُ التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

نقوش، محمد طفیل نمبر جلد اول و دوم، مرتبہ جناب جاوید طفیل صاحب، تقطیع کلاں، کل صفحات ۱۸۰۴، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۲۰۰ روپیے، پتہ: ادارہ فروغ اردو لاہور، پاکستان۔

جناب محمد طفیل (۱۹۲۳ - ۱۹۸۶) برصغیر ہند و پاک کے ایک نامور صحافی، اچھے انشاء پرداز اور کامیاب خاکہ نگار تھے، انھوں نے نقوش کے درجنوں طویل و ضخیم نمبر شائع کر کے اردو کی علمی و ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام ثبت کر دیا ہے، ان سب خاص نمبروں کی علمی و ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی، اور ان کو اپنے اپنے موضوع پر مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، بعض بعض نمبر تو کئی کئی جلدوں میں ہیں، جن میں اہم اور نایاب تحریروں اور غیر مطبوعہ کلام کو خاص طور پر منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے، آخر میں انھوں نے بارہ جلدوں میں نقوش کا نہایت شاندار رسول نمبر شائع کیا جس میں سیرت پر مختلف زبانوں کی بلند پایہ نگارشات کو اردو میں منتقل کر دیا ہے، ان کے یہ کمالات اور ان کی دوسری گوناگوں خصوصیات اس لائق تھیں کہ ان کی یادگار میں نقوش کا خاص نمبر شائع کیا جاتا، اسی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ان کے خلف الرشید جناب جاوید طفیل نے یہ معیاری اور محمد طفیل صاحب کے شایان شان نمبر شائع کیا ہے، جو مفید و متنوع مضامین کا مجموعہ

دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، یہ خاص نمبر خود محمد طفیل صاحب کے دور کے نقوش کی یاد دلاتا ہے، اس کی پہلی جلد میں ان کی شخصیت پر معروف اہل قلم کے مضامین درج ہیں، پھر ان کی غیر مطبوعہ تحریریں ہیں، "ناچیز" میں انھوں نے اپنے ذاتی اور خاندانی حالات، نقوش کی ادارت کے زمانے کے تجربات اور دوسری ضروری و مفید باتیں قلمبند کی ہیں، نیز ادیبوں، شاعروں اور دوسرے لوگوں سے اپنے روابط کی داستان بیان کی ہے، پھر "روزنامچہ" ہے، جو یورپ کے دو ماہی سفر کی دلچسپ روداد ہے، اور "سفرنامہ" میں انھوں نے آسان زبان اور موثر اسلوب میں اپنے سفر حج (۱۹۸۳ء) کے حالات و مشاہدات درج کیے ہیں، اس سے نئی نسل کے لوگوں کو حج اور مقامات حج کے بارہ میں مفید معلومات حاصل ہوں گی، اور ان میں حج بیت اللہ کا شوق اور داعیہ بھی پیدا ہوگا، اس کے بعد نقوش کے خاص خاص نمبروں پر مختلف مضامین درج ہیں، جن سے نقوش کے خاص خاص شماروں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی پڑتی ہے، جناب محمد طفیل نقوش کے ہر شمارہ کا آغاز "طلوع" کے دلچسپ اور انوکھے عنوان سے کرتے تھے، اس میں وہ موجودہ افکار و مسائل پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کرتے تھے، اس جلد میں ان کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے، اس میں ان کے خاص انداز تحریر پر دو مضامین بھی شامل ہیں، مکتوب نگاری میں بھی ان کا ایک منفرد اور جداگانہ انداز تھا، ان کے سیکڑوں خطوط علمی و ادبی قدر و قیمت کے حامل ہیں، چنانچہ "برادرم" کے عنوان سے ۱۶۴ مختلف النوع اہم شخصیتوں کے نام ان کے خطوط بھی اس جلد میں شائع کر دیے گئے ہیں۔

اس نمبر کی دوسری جلد بھی اپنے مضامین کے لحاظ سے اہم ہے، خاکہ نگاری محمد طفیل کا خاص طرۂ امتیاز تھا، اس صنف ادب پر ان کی کئی کتابیں یادگار ہیں، "آپ، جناب، صاحب، محترم، مکرم، معظم، مجتبیٰ اور مخدومی" ان کے خاکوں کے یہ مجموعے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے

چنانچہ منٹو، شوکت، جگر، نیاز، جوش، حکیم یوسف حسن خاں ایڈیٹر نیرنگ خیال اور شاہد احمد دہلوی پر ان کے خاکے اس جلد میں نقل کیے گئے ہیں، ایک اور خاکہ "مدیر نقوش" بھی ہے، جو انھوں نے اپنے بارہ میں لکھا تھا، ان کی خاکہ نگاری پر ممتاز ادیبوں اور معتبر خاکہ نگاروں کے مضامین بھی ہیں، پھر محمد طفیل کی شخصیت پر ایک خاص عنوان "انتظاریہ" کے تحت چند مضامین دیے ہیں جن سے ان کے شخصی اوصاف پر روشنی پڑتی ہے، محمد طفیل صاحب کے انتقال پر برصغیر کے رسائل و جرائد نے جو تعزیتی تحریریں شائع کیں، ادیبوں، سیاسی اور سماجی شخصیتوں نے جن تاثرات کا اظہار کیا، اور شعراء نے جو منظوم نذرانے عقیدت پیش کیے وہ بھی اس جلد میں محفوظ کر دیے گئے ہیں، ان کی وفات پر کہے گئے قطعات تاریخ کا ایک اچھا انتخاب بھی اس نمبر کی زینت ہے، اس جلد میں نقوش کے دور اول، دوم اور سوم کا مکمل اشاریہ بھی ہے، اس میں مضمون نگاروں کے ساتھ ان مضامین کی بھی فہرست دی گئی ہے جو نقوش کے ابتدائی عام شماروں یا پھر اس کے مسلسل ضخیم نمبروں میں شائع ہوتے رہے ہیں، یہ مضامین علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے اس قدر اہم ہیں کہ ان سے زبان و ادب اور مذہب و تاریخ کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں رہ سکتا، مگر سو سے زیادہ نمبروں میں کسی چیز کا تلاش کر لینا آسان نہ تھا، نقوش کے اس مفصل اشاریہ نے ان سے استفادہ کو آسان کر دیا ہے، جن سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، محمد طفیل نمبر کی دونوں جلدوں کی اشاعت اور نقوش کے گذشتہ اہم خاص نمبروں کا معیار قائم و برقرار رکھنے پر جاوید طفیل تحسین و آفرین کے مستحق ہیں، توقع ہے کہ آیندہ بھی وہ اسی طرح نقوش کے مفید نمبروں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا رہے گا، امید ہے کہ نقوش کے گذشتہ نمبروں کی طرح اس خاص نمبر کو بھی علمی و ادبی حلقوں میں حسن قبول حاصل ہوگا۔

غالب نامہ: قاضی عبدالودود نمبر، مدیر اعلیٰ پروفیسر نذیر احمد، تقطیع متوسط، صفحات ۲۷۵، قیمت ۴۰ روپے، کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر، پتہ:- غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

پروفیسر نذیر احمد کی ادارت میں ششماہی غالب نامہ کئی برسوں سے نکل رہا ہے اور اس نے بہت جلد علمی و ادبی حلقوں میں اپنی امتیازی جگہ بنالی ہے، اس کے کئی خاص نمبر پہلے شائع ہو چکے ہیں، یہ خاص شمارہ قاضی عبدالودود پر مضامین کے لیے مخصوص ہے، جس میں فروری ۲۰۰۶ء میں ایوان غالب کے سمینار میں قاضی صاحب پر پڑھے جانے والے مقالات اور معاصر پٹنہ کے قاضی عبدالودود نمبر کے دو ایک مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں اس سے قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تفصیل سامنے آجاتی ہے، فن تحقیق پر دو مضامین بھی اس نمبر میں شامل ہیں، قاضی صاحب کا مضمون "اصول تحقیق" اور پروفیسر نذیر احمد کا مضمون متن کی تصحیح و تنقید میں تخریج و تعلیق کی اہمیت کی نوعیت کے ہیں، آخر میں جمیل احمد خاں کا ترتیب دیا ہوا مفصل اشاریہ ہے جس میں قاضی صاحب کے مقالات و تالیفات کی فہرست دی گئی ہے، یہ نمبر اگرچہ زیادہ جامع اور ضخیم نہیں ہے تاہم اس سے ان کے ذاتی اوصاف و کمالات اور تحقیقی کاموں کا اچھا تعارف ہو گیا ہے، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے قاضی صاحب اور محمود شیرانی کی ہم آہنگی کو واضح کیا ہے، مگر ان کا یہ خیال کہ معارف کے ایک اداریہ میں شیرانی کو اوسط درجہ کا فارسی داں قرار دیا گیا تھا غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے، کیونکہ مذکورہ اداریہ میں محمود شیرانی کا ذکر اس طور پر کیا گیا ہے کہ "انگریزی کی استعداد پوری تھی، فارسی کی تعلیم متوسط اور عربی کی معمولی مگر ـــــ" دراصل یہ عبارت شیرانی صاحب کی مدح میں ہے اور اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی محنت اور شوق مطالعہ و تحقیق کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ

کیا اور بہت سے تحقیقی کام کیے، چنانچہ دو مضمون میں حافظ محمود شیرانی صاحب کی شخصیت
اور ان کے تحقیقی کارناموں کو سراہا گیا ہے، اس سے ہرگز وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو مضمون نگار نے
نکالا ہے، کئی مقالہ نگاروں نے قاضی صاحب کے شخصی اوصاف، ان کے تحقیقی ذوق اور
ان سے اپنے تعلقات بیان کیے ہیں، ان میں جناب فخرالدین علی احمد سابق صدر جمہوریۂ ہند،
پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر سید حسن عسکری، پروفیسر سید امیر حسن عابدی اور پروفیسر محمد حسن کے نام
قابل ذکر ہیں، ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے قاضی صاحب کے اب و جد پر روشنی
ڈالی ہے، پروفیسر عطا کاکوی نے یہ دکھایا ہے کہ قاضی صاحب کی تعلیم کا آغاز عربی و حفظ قرآن
سے ہوا، چنانچہ اپنے والد کے انتقال کے وقت وہ حافظ ہو گئے، مگر پھر رد عمل ہوا اور انھوں نے
عصری علوم کی طرف توجہ کی، اس طرح وہ مسجد کا امام بننے کے بجائے امام المحققین ہو گئے، انھوں نے
قرآن مجید کو طاق نسیاں پر رکھ دیا، اور تحقیقی کارنامے انجام دیے، وغیرہ حیرت ہے کہ پروفیسر صاحب نے
قاضی صاحب کی ان باتوں کی بھی تحسین کی ہے، کیا اس سے ان کے ممدوح اور خود ان کے بارہ میں کوئی
حسن ظن قائم کیا جا سکتا ہے، پروفیسر کلیم الدین احمد کا یہ تجزیہ مناسب ہے کہ قاضی صاحب اپنی طبعی
افتاد طبع اور معاشی فارغ البالی کی وجہ سے نہ کہیں ملازم ہوئے اور نہ ہی کسی اجتماعی نظم سے وابستہ
ہوئے، اس کی وجہ سے باہمی تعلقات ان کے ذوق و مزاج کی تشکیل پر اثر انداز نہیں ہوئے
اور ان کی خلوت پسندی ہی نے ان کے اندر قطعیت اور وقار کی کیفیت پیدا کر دی تھی، انھوں
نے یہ بھی لکھا ہے کہ سائنٹسٹ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو نئی نئی باتیں دریافت کرتے
ہیں، اور دوسرے وہ جو ان نئی دریافتوں کو تنقید کی روشنی میں دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک
قاضی صاحب کا تعلق دوسری قسم سے ہے، رشید حسن خان نے قاضی صاحب پر ایک تبصرہ نگار
کی حیثیت سے بحث کی ہے، ان کے نزدیک تعمیری اور تخریبی تحقیق کی اصطلاحیں درست نہیں ہیں،

قاضی صاحب کے جن مقالات میں دوسروں پر جو تنقید کی گئی ہے وہ تخریبی نہیں ہے، کیونکہ اس میں
جا بجا مثبت تحقیق کے بھی نمونے ملتے ہیں، پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "اردو میں تحقیق کی روایت
اور قاضی عبدالودود" اور ڈاکٹر خلیق انجم نے قاضی صاحب سے قبل اردو تحقیق اور متنی تنقید"
کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ متوازن ہے اور اس سے قاضی صاحب کے تحقیقی کاموں کی
قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے، اس نمبر میں قاضی صاحب کا عکس تحریر بھی دیا گیا ہے مگر اس میں نیچ
اشعار کے بارہ میں یہ صراحت ضروری تھی کہ وہ کس کے ہیں، کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں مثلاً
نظامی گنجوی (ص ۱۹۳) تو اس (۹۳) اور مسعود حسین (۱۹۹) [illegible] اصل میں گنجی، تو اس اور حسینی ہے
ایک جگہ لکھا ہے "محمد قزوینی نے ..... اس تغیر بی عمل کی .... چند مثالیں دی ہیں" (ص ۱۹۱)
خط کشیدہ کو "تغیر عمل" لکھنا چاہیے تھا۔

مذہب کے بارہ میں قاضی صاحب کے تصورات و عقائد معلوم و مشہور ہیں، اس سے قطع نظر
ان میں بعض حیثیتوں سے کمی تھی جس کا اثر ان کے بعض ادبی و تحقیقی خیالات پر بھی ہوا، اس نمبر میں ان
پہلوؤں کو یا تو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا ان کو بھی قاضی صاحب کی مدح و منقبت میں شمار کیا گیا ہے
تاہم ان کے عالم و محقق ہونے میں کلام نہیں اور اس اعتبار سے یہ نمبر مفید اور ادب و تحقیق کے طلبہ کیلئے کارآمد ہے

ع۔ ص

اوراق گل

مرتبہ جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت مناسب، صفحات ۲۲۴، مجلد مع گردپوش،
قیمت ۵۰ روپیے، پتہ (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ (۲) انجمن تہذیب نو پبلیکیشنز ۲۰۷ چک الہ آباد۔

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری جب بھی اعظم گڑھ اور اس کے نواح کے کسی مشاعرہ میں
آتے تو جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سے ملاقات کے لیے دارالمصنفین ضرور تشریف لاتے

شاہ صاحب ان کے بڑے قدردان اور خود بھی شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، ایسے موقع پر دار المصنفین کے رفقاء اور اہلِ ذوق حضرات جمع ہو کر جوہر صاحب کا کلام گھنٹوں سنتے، لیکن سیری نہ ہوتی، وہ جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی ہیں، ایک دفعہ انھوں نے اپنے خاص ترنم سے دار المصنفین میں یہ غزل سنائی:

کیسا قرب، کہاں کی دوری   عشق میں دونوں غیر ضروری

پوچھ نہ کچھ ہنگامِ حضوری   اہلِ محبت کی مجبوری

اللہ اللہ شانِ حضوری   دل سے قربت آنکھ سے دوری

تجھ کو بھلا کر اب میں سمجھا   یاد تھی تیری کتنی ضروری

دل کی طلب توہینِ طلب ہے   عشق میں جو ہو جائے پوری

دل کے بدلے درد ملا ہے   مل گئی قیمت پوری پوری

جلوہ جلوہ، پردہ پردہ   قربت قربت، دوری دوری

شاہ صاحب ہر ہر شعر کو بار بار پڑھواتے، انھوں نے ہی بتایا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم بھی جوہر صاحب کی اس غزل کو بہت پسند کرتے تھے، جوہر صاحب ان شعرا میں نہیں ہیں جو "کاتا اور لے دوڑی"، ان کی شاعری کی عمر نصف صدی کو محیط ہے، اتنے طویل عرصہ کے بعد اب انھوں نے اپنے کلام کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے جو اسی طرح کی پُر کیف اور عارفانہ غزلوں سے معمور اور اصغر اور جگر کی یاد دلاتا ہے اسی رنگ کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

اے خوشا جلوہ گاہِ قربِ حضور   زندگی ہو گئی مجسّم نور

بات کیا ہے کہ مدعائے دل   بھول جاتا ہوں جا کے ان کے حضور

دیکھتا ہوں کچھ ایسے جلوے بھی   جو بظاہر نظر سے ہیں مستور

شکوۂ دوست برملا جوہر   اہلِ دل کا نہیں ہے یہ دستور

ان کی یہ غزل بھی قابلِ توجہ ہے:

جب بھی ان سے کلام ہوتا ہے   ہر سخن ناتمام ہوتا ہے

عشق جس کے ہزار معنی ہیں   ایک سادہ پیام ہوتا ہے

عالمِ بے خودی میں اے جوہر   ان سے اکثر کلام ہوتا ہے

چھوٹی بحروں میں انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ خاص طور پر سوز و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، مثلاً:

راہِ جنوں کے اُف یہ مراحل   جتنے آساں اتنے مشکل

عالمِ عرفاں اللہ اللہ   چشم بہ جلوہ گام بہ منزل

ایک اور غزل کے چند شعر ہیں:

عقل کو جس نے روشنی بخشی   وہ جنوں ہی کا فیض عام نہ ہو

موت سے دور بھاگنے والو   زندگی موت ہی کا نام نہ ہو

دل سے دل یوں بھی ملتے ہیں جوہر   کوئی نامہ نہ ہو پیام نہ ہو

چندر پرکاش جوہر کو غزل گوئی سے اصل مناسبت ہے، وہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے شور و غوغا میں بھی تغزل کی آرائش و زیبائش سے غافل اور اس کی علامتوں اور لب و لہجہ سے منحرف نہ ہوئے، ان کا تغزل حسن و عشق کی رنگینی اور الفت و محبت کی پاکیزگی سے معمور ہے، ان کے نزدیک محبوب کے غم سے بڑھ کر کوئی چیز نشاط انگیز نہیں ہے اس لیے وہ اس پر آہ و فغاں کی صدا بلند کرنے کے بجائے اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں ؂

کچھ اس ادا سے عشق کے صدمے اٹھائیے   دل غم سے رو رہا ہو، مگر مسکرائیے

وہ غزلوں کو نئے روپ میں ڈھال کر نئے افکار و مسائل بھی بیان کرتے ہیں، انھیں غزلوں کی تنگ دامانی کا شکوہ نہیں۔

جو سمجھتے ہیں کہ محدود ہے دامانِ غزل — یہ مری تازہ غزل ان کو سنا دو یارو

اشعار میں جن کے نئے افکار نہیں ہیں — شاعر ہیں مگر آج کے فن کار نہیں ہیں

غزلوں کو نئے روپ میں ڈھالا ہے جنھوں نے — شاعر ہیں، روایت کے پرستار نہیں ہیں

وہ وقت کی مصلحتوں سے منہ موڑنے کے بجائے زمانہ کے حالات سے باخبر ہونے کی دعوت دیتے ہیں

وقت کی مصلحت سمجھ وقت کا اعتبار کر — جس سے ملے حیاتِ نو راہ وہ اختیار کر

وہ چمک رہا ہے سر پہ نئی زندگی کا سورج — ہیں غضب کے سونے والے انھیں کچھ خبر نہیں ہے

انھوں نے جا بجا عہدِ حاضر کے ابتر حالات پر اپنے درد و کرب کا اظہار کیا ہے:

اس دور میں ہر لحظہ اک تازہ مصیبت ہے — جینا بھی قیامت ہے مرنا بھی قیامت ہے

یہ دورِ سیاست بھی کیا دورِ سیاست ہے — مذہب کی نمائش ہے ایماں کی تجارت ہے

انھیں اپنے وطن سے بھی محبت ہے اور وہ اس میں بسنے والے ہر ہر فرد کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں خواہ اس کا تعلق کسی مذہب و ملت سے ہو اور انسانی عظمت کا نقش دلوں میں جاگزین کرتے ہیں۔

انسانیت کو حاصلِ ایماں بنائیے — مستقبلِ جہاں کو درخشاں بنائیے

دنیا کو ضرورت ہے اب اس درس کی جوہر — جو آج کے انسان کو انسان بنا دے

ان کی شاعری کا یہ مقصد کتنا برتر اور عظیم ہے:

دل میں ہے مرے جذبۂ تعمیرِ محبت — انسان ہوں انسان کا غم لے کے اٹھا ہوں

فن کی عظمت کا تصور کبھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتا اس لیے ان کی یہ تعلّی بیجا نہیں ہے:

دماغ ان کا مہکتا ہے بوئے گُل کی طرح — جو میرے گلشنِ شعر و سخن سے گذرے ہیں

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری کا یہ مجموعہ اسم بامسمّٰی ہے، ان کے کلام سے ہمیں عشق و محبت کی قدر و قیمت اور آدمیت کی عظمت و برتری کا احساس ہوتا ہے خودی و خودداری اور جہد و عمل کا پیام ملتا ہے، جوہر صاحب زندگی کے حقائق و مسائل، معرفت کے اسرار و نکات سے آگاہ کرتے اور غم کی عظمت کا شعور عطا کرتے ہیں، مشکلات اور دشواریوں میں جنون و سرمستی اور عزم و حوصلہ سے کام لے کر مایوس اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتے اور ان سب کے باوجود تغزل کی رعنائی و دلکشی اور لطافت و حلاوت میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔

اللہ کتنی تیرہ و تاریک ہے حیات — جی چاہتا ہے شمعِ محبت جلائیے

کارنامے ہیں ابھی راز میں دیوانوں کے — یہ فسانے ابھی محتاج ہیں عنوانوں کے

پاؤں بڑھتے ہیں جدھر بھی ترے دیوانوں کے — ذرے تعظیم کو اٹھتے ہیں بیابانوں کے

دل کے نازک معاملات نہ پوچھ — بڑھ نہ جائے کہیں یہ بات نہ پوچھ

دل پہ گذری جو واردات نہ پوچھ — ان کی نظروں کی کوئی بات نہ پوچھ

میں نے اک آہ میں رودادِ محبت کہہ دی — لوگ کرتے رہے تفسیرِ فغاں میرے بعد

شبِ تاریک میں اے راہِ منزل ڈھونڈنے والو — دلوں کے داغ چمکاؤ، ستاروں کا بھروسہ کیا

بہ ہزار علم و حکمت بہ ہزار فہم و دانش — ترے حسن کی حقیقت نہ سمجھ سکا زمانہ

اک اک قدم پہ منزلِ مقصود بن گئی — گذرا ہوں جس مقام سے عزمِ سفر لیے

غزل کے ساز پہ رکھ دیں جب انگلیاں میں نے — بکھیر دیں غمِ دوراں کی دھجیاں میں نے

مجموعہ کی ابتدا نعت سے کی گئی ہے، اس کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو

دنیا کا عقیدہ بھی ہے، اپنا بھی یقیں ہے — جو بات ہے طیبہ میں کہیں اور نہیں ہے

شروع میں متعدد اصحابِ علم و فن نے کلام جوہر کے بارے میں جو تاثرات قلمبند کیے ہیں ان سے بھی اس کی اہمیت و مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ "اوراقِ گل" کی اشاعت سے اردو کی شعری و ادبی فضا معطر ہوگی۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

اطبار اوران کی مسیحائی مرتبہ جناب حکیم محمد مختار اصلاحی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۳۱۲ مجلد مع مصور گردپوش قیمت ۵۰ روپیے، پتہ اصلاحی دواخانہ فینسی محل محمد علی روڈ بمبئی ۴

جناب حکیم محمد مختار اصلاحی ایک بہت کامیاب اور حاذق طبیب ہیں، ان کی اوران کے لایق فرزندوں کی مساعی جمیلہ سے موجودہ ناسازگار حالات میں بھی طب یونانی کو غیر معمولی فروغ ہورہاہے، ان کے مطب سے بمبئی کے لوگ مدت دراز سے فیضیاب ہورہے تھے، اب انھوں نے اصلاحی ڈرگ ہاؤس کے نام سے دواؤں کو جدید طرز پر تیار کرنے کے لیے ایک فیکٹری بھی قائم کی ہے، اس طرح ان کا دائرہ فیض حدود بمبئی سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گیا ہے، وہ اپنی تحریر و تقریر سے بھی اس فن کا بول بالا کرتے رہے ہیں، پندرہ روزہ مسیحا عرصہ تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا، اور اب انھوں نے اپنے قدردانوں کیلئے یہ علمی سوغات پیش کی ہے، اس مفید دلچسپ اور معلومات سے بھری ہوئی کتاب میں درجنوں ممتاز مشاہیر اطباء کے مختصر حالات و واقعات، فن طب میں ان کی حذاقت و کمال، مختلف اہم اور لاعلاج بیماریوں میں ان کے کامیاب طریقہ علاج اور مجرب نسخے مع اوزان درج کیے ہیں، اس کی ابتدا یونانی دور کے طبیبوں سے کی ہے جیسے ارسطو، جالینوس اور بختیشوع وغیرہ پھر اسلامی دور میں عہد عباسی اور ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے دور کے متعدد اہم طبیبوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ہندوستان کے شریفی اور عزیزی خاندانوں کے اطباء کے طبی کارناموں اور حیرت انگیز طریقۂ علاج پر بحث کی ہے اور آخر میں اس عہد کے اطباء حکیم عبد الحمید دہلوی اور ان کے برادر خورد حکیم حافظ محمد سعید دہلوی کے علاوہ خود اپنی بعض کامیاب تشخیص اور تیر بہدف طریقہ علاج کا ذکر کیا ہے، کتاب جابجا اصحاب علم و حکمت کے مفید اور حکیمانہ اقوال سے بھی مزین اور دلچسپ انداز اور سلیس و شگفتہ زبان میں لکھی گئی ہے اور اس سے مصنف کے حسن ذوق اور محنت و صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۱ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۸ء عدد ۶

مضامین